ناچیز تالیف کو

ب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ

کے اسم گرامی پر

معنون

کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہوں

جن کی علم پروری اور ادب نوازی کے باعث دکنی ادب کے شہکار طبع

ہو کر منظر عام پر جلوہ گر ہو رہے ہیں ۔ فقط۔

ہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

مضمون نگاری کا جو شوق عمر کی ابتدائی منزلوں میں پیدا ہوا تھا، وہ مسلسل ترقی کرتا رہا۔ مضامین جو لکھے گئے اور جو ہندوستان کے معیاری رسائل میں شائع ہوئے، ان کی تعداد اب دو سو تک پہنچ گئی ہے، اس شوق نے اب اس سودے کی صورت اختیار کی ہے۔ کہ ان مضامین کے مجموعے مرتب کئے جائیں، اس سلسلہ کی پہلی کڑی "ذکر نبی" تھی۔ اب یہ مجموعہ ادبی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان کی تفصیل اور جن رسالوں میں وہ شائع ہوئے۔ ان کی صراحت ذیل میں درج کی جاتی ہے

۱۔ خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری	رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۶ء
۲۔ بہمنی حکومت کا ایک دکھنی شاعر	معارف ۱۹۳۲ء
۳۔ نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی	معارف ۱۹۳۲ء
۴۔ خاور نامہ دکھنی	معارف ۱۹۳۰ء

۵۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی کا ہندوستانی کلیات	معارف ۱۹۳۳ء
۶۔ ولی کے پہلے دکن کی اردو شاعری	الموسی ۱۹۳۷ء
۷۔ ولی کا غیر مطبوعہ کلام (یورپ کے دواوین سے)	معارف ۱۹۳۰ء
۸۔ ولی کا غیر مطبوعہ کلام (ایک خاندانی مخطوطہ سے)	ہندوستانی ۱۹۴۳ء
۹۔ وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے	مکتبہ حیدرآباد ۱۳۴۰ف
۱۰۔ دکن کے بعض مرثیہ گو	ادبی دنیا ۱۹۳۰ء
۱۱۔ مرزا کے مرثیے	شہاب ۱۳۴۲ف
۱۲۔ ارسطو جاہی ہندوستانی قصیدے	رہبر دکن ۱۳۴۵ف
۱۳۔ شعرا الہند اور دکن	ہزار داستان جلد ۳،۲
۱۴۔ انڈیا آفس کی کیٹلاگ میں دکنی مخطوطات کی فروگذاشتیں	معارف ۱۹۲۹ء
۱۵۔ اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ کی چند قابل توجہ فروگذاشتیں	جامعہ ۱۹۳۲ء
۱۶۔ تاریخ نثر اردو پر ایک تنقیدی نظر	معارف ۱۹۲۳ء
۱۷۔ مقدمہ سب رس پر ایک تنقیدی نظر	رہبر دکن ۱۳۴۲ف
۱۸۔ اردو لٹریچر (مصنفہ ڈاکٹر بیلی) اور رسالہ اردو	شاہجہان ۱۹۳۴ء
۱۹۔ مغل اور اردو پر ایک سرسری نظر	شاہجہان ۱۹۳۳ء

۲۰۔ جواہر سخن پر ایک نظر	شاہجہان ۱۹۲۴ء
۲۱۔ فتوت کا تذکرہ شعرائے اردو	ہندوستانی ۱۹۳۳ء
۲۲۔ تمنا کا تذکرہ شعرا	معارف ۱۹۳۵ء
۲۳۔ کیمبرج کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست	معارف ۱۹۲۹ء
۲۴۔ پیرس کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست	معارف ۱۹۳۰ء

چونکہ یہ مضامین آج سے بہت پہلے شائع ہوئے تھے، اس لئے اب ان میں ضروری کمی وبیشی لامحالہ کرنی پڑی۔

اس امر کی ضرورت نہیں معلوم کہ ان مضامین کے متعلق کچھ لکھا جائے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ مضامین اپنی زبان کی خدمت کرنے کے جذبہ کے تحت لکھے گئے ہیں، اور توقع ہے کہ وہ زبان کے دوسرے خدام کے لئے کچھ نہ کچھ مفید ثابت ہوں گے۔

یہاں یہ بات واضح کرنی نامناسب نہیں، کہ ابھی ہمارے ہاں "تنقید" کے متعلق افراط و تفریط بھی ہوئی ہے، تنقید یا تو تنقیص کی صورت اختیار کر لیتی ہے، یا بے جا ستائش کی، اس مجموعہ میں جو تنقیدی مضامین شریک ہیں، ان کے لکھنے میں یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ

تنقید کا اصلی مفہوم نظر انداز نہ ہوجائے، البتہ "سب رس" کے مقدمہ کی تنقید میں کچھ تلخی سی پیدا ہوگئی ہے لیکن اس میں بھی کوئی بات خلاف واقعہ نہیں ہے۔

محرر مضامین کو اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کا اعتراف ہے، اور ناظرین سے عفو کا مستدعی ۔ فقط

شہریور ۱۳۴۶ ف	نصیر الدین ہاشمی
جمادی الاول ۱۳۵۶ھ	(حیدرآباد دکن)

پیش لفظ

(از جناب مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے)

میرے دوست سید نصیر الدین ہاشمی صاحب ان لوگوں میں ہیں۔ جو سارے دن دفتر کا کام کرنے کے بعد بھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ گھر پر بھی کچھ نہ کچھ لکھے ہی جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت کچھ لکھ چکے اور چھپوا چکے ہیں انہوں نے صرف ایک ہی مضمون کو لیا ہے اور اسی دائرہ میں اپنی کوششوں کو صرف کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگ کچھ کر جاتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے کارنامے کچھ رہ جاتے ہیں۔ بھلا دنیا میں وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ جو دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ چلائیں اور اس لوٹ میں بے جوڑ اور انمیل جو مال بھی ہاتھ لگے۔ اس کو کباڑی کی دوکان کی طرح اوپر تلے جمائیں اور پبلک میں پیش کر کے ادیب ہونے کے دعویدار ہوں؛

کم سے کم ہندوستان میں کچھ عرصہ پہلے تک "حب وطن" ایک ایسا

بناتی ہیں ؛

اب رہا خیالات کا فرسودہ ہونا۔ تو اس کے متعلق میری کیا سب کی رائے ہے کہ اچھے خیالات کبھی فرسودہ ہوتے ہی نہیں۔ دَور زمانہ سے زباں بدل جاتی ہے۔ مگر خیالات نہیں بدلتے۔ ہاں یہ ضروری ہے۔ کہ اپنے بزرگوں کے حالات نہ پڑھ کر ہم اُن کے خیالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ ہماری نظر محدود اور ہماری ہمت مفقود ہوجاتی ہے۔ اور ہم دوسروں کو اچھا اور اپنوں کو بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ خود کو ذلیل سمجھنا اور دوسروں کی نقالی کرنا ادبار کا آخری درجہ ہے ؛

ایک عام خیال یہ پیدا ہوگیا ہے۔ کہ شاعر سے زیادہ بیکار شئ دنیا میں کوئی نہیں لیکن اگر دنیا کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اُن کے شعرائ نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیئے ہیں۔ اور گو اُن کی شاعری آخر زمانہ میں عشق کے جھوٹے اور سچے واقعات کا ایک جال بنکر رہ گئی ہے۔ پھر بھی لبا اوقات شکستہ دلوں کے حق میں مرہم کا کام کر جاتی ہے اور اکثر پژمردہ دلوں کو ازسرِنو شگفتہ کر دیتی ہے ؛

میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ جو مضامین اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ اُن کی زبان وہ نہیں ہے۔ جو اب بولتے اور سمجھتے ہیں لیکن ایسی بھی نہیں ہے۔ کہ اس کا پڑھنا اور سمجھنا ذرا سی کوشش کے بعد بھی مشکل ہو۔ میں یقین دلاتا

ہوں۔ کہ ذرا سی محنت کے بعد آپ اس میں چل نکلیں گے اور پھر دکھنی اردو
کے سب خزانے آپ کی ملک ہے۔ آپ اس میں ایسے جواہر پارے پائیں گے
کہ آج کل کی شاعری میں ان کا ملنا ناممکن ہے۔ ان خیالات کو لینا اور موجودہ
زبان میں ان کو تبدیل کر کے اہل ملک کے سامنے پیش کرنا اب آپ کا کام ہے
اگر آپ نے یہ کر لیا تو بڑا کام کیا۔ آپ نئی دنیا اور پرانی دنیا کو ملا کر ایک ایسی دنیا
پیدا کریں گے۔ جس کی اس وقت زمانہ کو بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ کی
رفتار ہمارے اخلاق اور حالات کو تباہ کر رہی ہے اور اپنے بزرگوں کے حالات
سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس رَو میں بہے چلے جا رہے ہیں؛
ممکن ہے۔ کہ آپ کو یہ خیال پیدا ہو کہ دوسروں کے خیالات کو نقل کرنا "سرقہ"
ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیا اپنے کسی بزرگ سے جائداد حاصل کرنا "چوری"
ہے۔ یہ ہمارا قدرتی حق ہے۔ البتہ اس جائداد کی اصلاح نہ کرنا اور اس کو یوں
یوں ہی پڑے پڑے تلف ہو جانے دینا نہ صرف دنیا کی نظروں میں اپنے
آپ کو بے وقوف بنانا بلکہ خود کو "ناہنجار اولاد" ثابت کرنا ہے۔ بہرحال ہاشمی
صاحب کو جو کرنا تھا وہ انہوں نے کیا۔ اب اس سے کوئی فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا
آپ کا کام ہے ؛

سپردم بتو مایۂ خویش را ؛ تو دانی حساب کم و بیش را

فارسی اور عربی کے علاوہ اسی دکھنی میں درس دیا کرتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب جو "معراج العاشقین" سے موسوم اور نثر میں ہے۔ شائع ہو گئی ہے۔
لیکن ہنوز اس کی تحقیق باقی ہے۔ کہ آپ نے دکھنی نظم میں طبع آزمائی کی ہے یا نہیں۔

راقم نے اپنی تالیف "دکن میں اردو" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں حسب ذیل تین شعروں کے متعلق صراحت کی ہے۔ کہ یہ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں:-

پانی میں نمک ڈال مزہ دیکھنا دسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے۔

یوں کھوئی خودی اپنی خدا ساتھ محمد
جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی دسے

آنتوں بلبیلہ آنتوں لون
پیتین کے گھر جائے کون۔

یہ اشعار رسالہ النساء (حیدر آباد) میں نمکین کاظمی صاحب نے شائع کئے تھے

غزل کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں :-

تون تو صحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
ہوئے نرم نہ تجھ ادچڑے لیس کھائیگا آواز توں
سینچ گھوڑا زور ہے خود خیال اس کا ہور ہے
تن لوٹنے کا چور ہے نہ چھوڑ اس بد ٹھار توں
تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائیگا
تب عشق جھگڑا پائے گا خد مارلے تروار توں
شہباز حسینی کھوے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر
اللہ آپلے یک ہوے کر تب پاویگا دیدار توں

اس کے پیشتر کہ آپ کے کلام کے متعلق مزید صراحت کی جائے۔ دو امر کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ کیا خواجہ صاحب کی غزل قدیم طرز ریختہ میں ہے؟ دوسرا آپ کا تخلص۔

شمالی ہند میں عام طور سے ایک زمانے میں اردو نظم کا نام ریختہ تھا۔ مگر دکن میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ یہاں ریختہ صرف اس خاص نظم کو کہتے تھے جس میں مصرعے فارسی سے مرکب ہوتے تھے۔ چنانچہ کلیات شاہی میں جو سلطان علی عادل شاہ ثانی کا دیوان ہے اور قدیم زمانے میں مرتب ہوا ہے۔ ریختہ کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے :-

کی تین نظمیں ہیں۔ ایک میں سید محمد اور دو میں شہباز تخلص ہے +
مولانا عبدالحق نے اپنی کتاب میں جس مثلث کا ذکر کیا ہے۔ وہ دراصل
مثلث نہیں ہے کیونکہ اس کی پوری نظم دستیاب ہوئی ہے۔
زمانۂ قدیم میں تصوف کی نظموں کو "حقیقت" کے نام سے موسوم کرتے
تھے۔ خواجہ صاحب کی تینوں نظمیں بھی حقیقت کے نام سے لکھی گئی ہیں اور
موسیقی کے راگنیوں میں ہیں۔ ذیل میں ان کو درج کیا جاتا ہے۔

حقیقت رام گلی

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
او پیو میرے جیو کا بزقا لیا ہے
او معشوق بے مثال ہے نور نبی نپایا
نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بھایا
اپکوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا
کُنز کنزے پیو جیو میں اپسیں آپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھنے پاوے
جنہہ دیکھے اوسی کون اُسے اور نہ بھاوے
کل شیٔ محیط ہے اسی کون پچھانے

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ ہی کا ہے یا نہیں؟ ہم کو دکن کا جو قدیم سے
قدیم کلام ملا ہے۔ وہ نظامی کا ہے:۔
نظامی کا زمانہ ۸۶۳ھ کا ہے۔ اس کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ
ہے جس کے بعض شعر یہ ہیں:۔

کہوں سد ساجی نظامی دھرم   پدم سب سُنے بات بانجی کدم

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوار   پرت بال سینا کو تارا دھار

عطارد مسخر ہوا لے قلم   مسخر کیا سور دے ہت علم

اس کے کلام سے خواجہ صاحب کا کلام زیادہ صاف ہے۔ حالانکہ
بلحاظ زمانہ تدریجی ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے قطع نظر ایسا کوئی قطعی
ثبوت نہیں ہے۔ کہ کلام مندرجہ بالا کو خواجہ صاحب کا ہی قرار دیا جائے
بہت ممکن ہے۔ کہ یہ کلام یا اس میں سے بعض آپ ہی کا ہو۔ اور یہ
بھی ممکن ہے۔ کہ زمانہ بعد میں لوگوں نے آپ سے منسوب کر دیا ہو۔

چونکہ سردست قطعی ثبوت نہیں ملا ہے۔ اس لیئے ہم اس کے متعلق
کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کر سکتے ۔

بہمنی عہد حکومت کا ایک دکھنی شاعر

اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، کہ بہمنی دور (۷۴۸ھ سے ۹۳۲ھ) میں دکن میں اردو (دکھنی) کا رواج تھا، اور نہ صرف عام طور سے بول چال اور کام کاج میں اس کا استعمال تھا، بلکہ اوس نے تحریری مدارج بھی طے کر لئے تھے، چنانچہ اس کی نثر کے کئی نمونے دستیاب ہوئے ہیں، جن میں سے خواجہ بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کے تصانیف اور ان کے شاگرد سید محمد عبداللہ حسینی کا رسالہ نشاط العشق کا ترجمہ مشہور ہے۔
لیکن اس عہد کی نظم کے صحیح نمونے ہنوز دستیاب نہیں ہوئے تھے نظم کا جو صحیح نمونہ ملا ہے، وہ ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) کے دور کے شاعر وجہی کا کلام ہے، جس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ ۱۰۸۳ھ کے دور میں انتقال کیا تھا،

آج ہم ایک ایسے شاعر کا تعارف کراتے ہیں، اور اس کے کلام سے

ناظرین کو روشناس کراتے ہیں، جو عہدِ بہمنی سے تعلق رکھتا ہے، اس کا تخلص نظامی ہے اس کی ایک نامکمل مثنوی لطیف الدین ادریسی صاحب کے پاس تھی۔

مثنوی ناقص ہے، درمیانی اور آخری حصہ نہیں ہے، جو اشعار موجود ہیں ان کی تعداد تقریباً (۸۶۵) ہے۔ اس مثنوی کو کدم راؤ و پدم راؤ سے موسوم کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان ہی دو شخصوں کا قصہ منظوم ہوا ہے، شاعر کے تخلص کی تصدیق حسب ذیل اشعار سے ہوسکتی ہے :۔

جو ادا تھیں نہ چلی یرن کوئی　　نظامی کدھیں سن برس نہ ہوئی

نظامی مے دہر و کہ کیوں رادھے　　کہ پت درت کن پات دھن سودھے

کہوں سدرساجی نظامی دھرم　　پدم سب سنے بات بانجی کدم

نظامی کہنہار جس بار ہوئے　　سہنا سن لغز گفتار ہوئے

اس مثنوی کو دورِ بہمنی کی مثنوی قرار دینے کے وجوہات حسب ذیل ہیں،

(۱) اشعارِ ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ مثنوی بہمنی دور کی پیداوار ہے

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوار　　پرتبال سینسا کرتار ادھار

دھنین تاج کا کون راجا ابھنگ　　کنور شاہ کا شاہ احمد بھنگ

لقب شہ علی آلِ بہمن ولی ولی تہین بہت بدہ تدا کلہی

(ب) مثنوی میں مختلف عنوانات ہیں، جن میں سے ایک عنوان حسب ذیل ہے:۔

"مدح سلطان علاؤالدین بہمنی نوراللہ مرقدہٗ"

(ج) زبان کے لحاظ سے نہایت قدیم اور ابتدائی دکھنی کہی جا سکتی ہے کیونکہ اب تک قدیم سے قدیم جو کلام دستیاب ہوا ہے، اس سے بھی اس کی زبان زیادہ مشکل ہے۔

(د) رسم الخط کے لحاظ سے بھی یہ نہایت قدیم مثنوی قرار دی جا سکتی ہے اس کے بعد اب یہ امر تحقیق طلب ہے، کہ یہ مثنوی کس سنہ میں تصنیف ہوئی ہے، اس کے متعلق جو کچھ ہمارے معلومات ہیں۔ وہ صرف یہ ہیں، کہ یہ مثنوی علاؤالدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے، اور اس کے شہزادہ کا نام احمد شاہ تھا، لہٰذا اب اس امر کی تحقیق ہونی چاہیئے۔ کہ بہمنی خاندان میں سے کن کن بادشاہوں کا نام علاؤالدین تھا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ خاندان بہمنی میں پانچ بادشاہ علاؤالدین کے نام سے گذرے ہیں۔ یعنی:۔

(۱) علاؤالدین بہمن شاہ — بانیٔ خاندان — ۷۴۸ تا ۷۵۹ھ

(۲) علاؤالدین مجاہد شاہ — تیسرا حکمران — ۷۷۷ تا ۷۸۰ھ

(۳) علاؤالدین احمد شاہ ثانی — دسواں حکمران جو احمد شاہ کا لڑکا تھا — ۸۳۸ تا ۸۶۲ھ

(۴) علاؤالدین ہمایوں شاہ — گیارہواں حکمران — ۸۶۲ تا ۸۶۵ھ

(۵) علاؤالدین — سولھواں حکمران — ۹۲۷ تا ۹۲۹ھ

ان میں سوائے نمبر ۴ کے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا شہزادہ احمد ہو، صرف وہی ایسا حکمران ہے جس کا لڑکا احمد شاہ ثالث تھا، اور وہ ۸۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، اور ۸۶۷ھ میں فوت ہوا۔ اس کو اگرچہ مصنف تاریخ فرشتہ نے نظام شاہ سے موسوم کیا ہے، مگر جو سکّے ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ سے مضروب ہوئے۔ ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک ہے۔

اس سے قیاس ہوتا ہے۔ کہ یہ مثنوی اسی عہد میں تصنیف ہوئی ہے اس قیاس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، کہ شاعر بادشاہ کا مصاحب تھا، اور شاہی دربار سے اس کو تعلق تھا، چونکہ بادشاہ کا لقب عام طور سے نظام شاہ تھا، اس لئے بہت ممکن ہے، کہ شاعر نے اپنا تخلص بادشاہ کے نام پر نظامی قرار دیا ہو۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ادس کا سمجھنا ضرور کسی قدر دقت طلب ہے، بریں ہم اس مثنوی کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے، کہ نظامی اپنے عہد کا باکمال شاعر تھا اور اپنے فن میں استادانہ مہارت رکھتا تھا ؎

معارف اکتوبر ۱۹۳۲ء

نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی

"نورس" کا مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی المخاطب بہ جگت گرد ہے۔ جو بیجاپور کا چھٹا حکمران تھا، اپنے چچا علی عادل شاہ اول کے مارے جانے پر ۹۸۸ھ میں مسندِ حکومت پر جلوہ گر ہوا، اور طویل و کامیاب حکمرانی کے بعد ۱۰۳۷ھ میں انتقال کیا،

اس کی حکمرانی کا دور علم و ہنر کی ترقی کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس نے علم کی ترویج میں جو کوششیں کی ہیں، وہ تاریخِ دکن میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہیں گی، علمی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں اس کا خاص درجہ ہے، بیجاپور کے تمام مؤرخ اس کے

علم وفضل اور علم پروری کے معترف اور مدلح ہیں، جس کی تفصیل ہماری تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں کی گئی ہے (صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۵)۔

اس کی سرپرستی میں کئی بہترین تصنیفیں ہوئیں، جن میں سے بعض یہ ہیں ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی مشہور و معروف تاریخ گلزار ابراہیم الموسوم تاریخ فرشتہ ۱۰۱۵ھ میں تالیف کی، ملا ملک قمی نے مخزنِ اسرار نظامی کا جواب لکھا عبدالرشید التبکی نے علاؤالدین محمد بن ذکریا قزوینی کی مشہور کتاب عجائب المخلوقات کا فارسی میں ترجمہ کیا، نورالدین ظہوری نے اپنی مشہور تصنیفات لکھیں رفیع الدین شیرازی نے روضۃ الصفا کا خلاصہ کیا؛

ابراہیم کو شاعری کا بڑا شوق تھا، خود بھی زبردست شاعر تھا، ابراہیم تخلص کرتا تھا، فارسی اور دکھنی کے نامور شعرا اس کے زمانہ میں موجود تھے، جو نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ اپنی تصنیفات کی بدولت آج تک مشہور ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں، ظہوری، ملک قمی، حکیم آتشی، مرزا محمد مقیم مقیمی، ملا حبیبی، دولت شاہ، عبدالقادر نورسی، نوری اور امین وغیرہ،

سلطان نے دکھنی زبان کی خصوصیت سے سرپرستی فرمائی، شاہی دفتر کی زبان جو علی عادل شاہ کے زمانے میں فارسی کر دی گئی تھی، پھر سے دکھنی

ہوگئی، شعرائے دکھنی گو کا عروج ہوا، چنانچہ سلطان کے اسی شغف کا ایک
کارنامہ کتاب نورس ہے، اس کو خوشنویسی کا بھی بڑا شوق تھا، خلیل خان
تمام خوشنویسوں میں ممتاز تھا، اس کو موسیقی میں اور خاص کر سرود ہندی
میں بڑی مہارت تھی، اس وقت کے تمام باکمال گویے بیجاپور میں جمع
تھے، اس کی اسی مہارت اور کمال کا ایک زندہ ثبوت زیر بحث مخطوط ہے۔

سلطان کو "لفظ نورس" سے بڑی محبت تھی، ۱۰۰۵ھ میں ایک قلعہ
بنام "نورس" تیار ہوا، ۱۰۱۳ھ میں ایک شہر آباد کر کے اس کا نام "نورس پور"
رکھا گیا، شاہی مہر پر نورس کندہ تھا، سکہ پر نورس مضروب تھا، سالانہ ایک
جشن اسی نام سے ہونے لگا، درباری شاعری کو نورسی کا خطاب دیا گیا، اسی
طرح بادشاہ نے اپنی تصنیف کا نام بھی "نورس" رکھا۔

یہ کتاب اس نے دکھنی میں لکھی ہے - افسوس ہے۔ اس کی تصنیف
کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہو سکا، مگر اس قدر پتہ چلتا ہے۔ کہ اس کی تصنیف
۹۹۰ھ اور ۱۰۱۵ھ کے درمیان ہوئی ہے، بعض قرائن سے معلوم ہوتا
ہے، یہ ۱۰۰۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے،

اس وقت تک اردو علم ادب کی تاریخ میں جو نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں

(۲۳) "تصنیف ابراہیم عادل شاہ، مالک ایں کتاب نورسی"۔

اسی طرح نظم کے خاتمہ پر دو سطروں کی عبارت درج ہے، جو اگرچہ صاف معلوم نہیں ہوتی، تاہم جو واضح ہے۔ وہ حسب ذیل ہے :-

"حضرت . . . جہاں پناہ خلد اللہ ملکہٗ عجالہ باستکمال رسید بید الفقیر عصمت اللہ"۔

ابتدا، حسب ذیل عنوان اور شعر سے، ہوئی ہے :-

انچلی در مقام کوری

سیّد محمد میرے دل بہ ر نانو   جیون رسول کر لکھے عرش تہانو

خاتمہ ذیل کے شعر پر ہوا ہے :-

رام گیری راگنی کستوری   سیا سو کیس کیسی دھملا

اس کے برخلاف دفتر دیوانی کے نسخہ میں ابتدا اور خاتمہ کے اشعار بالکل جداگانہ ہیں جس کی صراحت آگے آتی ہے۔

لفظ نورس کئی ایک مقام پر لایا گیا ہے، مثلاً :-

بن بیچ تھا وی نورس کا آتی۔   بھر بھر دار دپیالا پیلانی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سید محمد [illegible]
[illegible]
[illegible]
حضرت محمد [illegible]

[illegible] سید محمد [illegible]

ناچھوڑیا جاوے دھان جو جیو دے سکوں

کون پندت یو د و بدیتی راکھوں

ابراہیم ملیں یو سب مشکل اکھوں

کمت وسی جیو حسن ر دیدینا   کبھی غلیف دھر موتیوں خونا

جیون دیپک میں وسی مدہ ناٹک نکینا   مشک عبیر چھپائی آنکھنا

سیوی رو بزچل ذوالقعدہ اینا

ابھوک

پوت نبی کا بدر مردانا   جس نیک برس ہووے زینا

ابراہیم خان یہ برسوں ہواسنا   جیون نوازش سب بخشے گنا

ابھوک

وہنی بوا نار جیو ملکی جہازی   سندر سمدر سنگات کرتار کنازی

ابراہیم اکتیس چتل سندر نتر و نتا دری

ببن

ایک سہت رند نرا نرسوں جنگل کرا   واہن بلیو رست جات گسائیں لشیرا

گاس گرت گنجرا پرشتہ چیر مرد کریا

درمقام نوروز نورس

سید محمد یتی پیرا   جیوں رتن میں اتم ہیرا

محل محل صدر سنواری   اس نونے بہشت اپاری

انند ہوتا ہے سدا بہاری   ارتی لیائے انبر بھر ناری

کدم کستوری جوا چندر لاہی   بادل کاں سی ہر رنگ دس پر ساری

شمامی عنبر بتیاں پھرائی   شربت گھول امرت پلائی

بادل دمامے بجلیاں بجاوے   باجی خالو آشتابی آنے پاوے

سہلا نورس کلیاں دھاوے

ابراہیم گر کنی گاوے

امید ہے۔ کہ اس وضاحت سے نورس کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے،

(معارف)

خاور نامہ دکھنی

یہ ایک دکھنی رزمیہ مثنوی ہے۔ جو بعہد محمد عادل شاہ بیجاپور (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۶۷ھ) تصنیف ہوئی ہے۔ چونکہ یہ فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے، اولاً اصل فارسی کتاب کے متعلق صراحت کی جائے۔

خاور نامہ فارسی ابن حسام کی تصنیف اور سنہ ۸۳۰ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

اس کا ایک نسخہ برٹش میوزم میں اور دو نسخے انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ برٹش میوزم کا نسخہ باتصویر ہے، جو ۹ رمضان سنہ ۱۰۹۷ھ میں لکھا گیا ہے، اس کا ذکر فارسی قلمی نسخوں کے کیٹلاگ کے صفحہ (۶۴۲) نمبر (۱۹۷۶۶) پر درج ہے، اس کو مول چند ملتانی نے نواب کمال الدین خاں کے لئے لکھا ہے،

انڈیا آفس کا ایک نسخہ باتصویر ہے، جس کا سنہ کتابت درج نہیں ہے دوسرا نسخہ بلاتصویر ہے۔ یہ جمادی الاول سنہ ۹۶۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب محمود بن عبدالرحمٰن ہے؛

ابن حسام کو بعض اصحاب حسام الدین اور بقول بعض محمد حسام کہا جاتا ہے قہستان کا باشندہ، اپنے زمانہ کا نامور باکمال عربی اور فارسی کا شاعر تھا،

خاور نامہ کے علاوہ اس کی دیگر تصانیف بھی ہیں۔ بعہد عمر مرزا ابن تیمور گورگاں ۸۷۵ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ "خوسف" میں مدفون ہے +

اس نے خاور نامہ کو شاہ نامہ فردوسی کی تقلید میں لکھا ہے، اس لئے اس کو فردوسی ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، ابن حسام نے خاور نامہ میں فردوسی کی تعریف کی ہے +

اس کتاب میں کسی بادشاہ کی مدح نہیں ہے اور مصنّف نے ظاہر کیا ہے کہ صرف ایک روٹی پر گذر ہوتی ہے، چنانچہ لکھتا ہے :۔

بیک قرص تا شب از بام گاہ   قناعت کنم چو خورشید و ماہ

شکم چوں بیک نان تواں کرد سیر   مکش منت سفرۂ اردشیر

ایتھے انڈیا آفس کے کیٹلاگ کے مصنف کا بیان ہے کہ اس کتاب کا مواد ایک عربی کتاب سے لیا گیا ہے، تصنیف کی تاریخ خود مصنف کے بیان کی ہے :۔

چو بر سال ہشتصد بیفردوسی   شد این نامہ تازیاں پارسی

مرا این نامہ را خاوران نامہ نام   بنادم بر آنکہ کردم تمام

انڈیا آفس کے باتصویر نسخہ میں علی ابراہیم خان نے ۱۱۸۹ھ میں کتاب

اور مصنف کے متعلق مختصر فارسی نوٹ درج کیا ہے، جو حسب ذیل ہے :-

"نام این کتاب خاور نامه۔ نام مصنف این کتاب ابن حسام است، که
فاضل و شاعر کامل ساکن قهستان من اعمال خراسان بود، اشعار در عربی
و فارسی بسیار گفته است، اینکه خاوران نام ولایتی ست از خراسان و
مسکن مصنف این کتاب از توابع خراسان است و نیز بسبب اینکه خاوران
در لغت مشرق و مغرب را گویند و بقول مصنف این فسانه ها در مغرب زمین
روداده بنابرین خاور نامه نام نهاد، و این خاور نامه در مملکت ایران خاصه
در اصفهان و خراسان شهرت داد، اگرچه اصل این حکایتها از صورت
راستی معرا است، ابن حسام مصنف خاور نامه مذکور در وقت شیخ علی مرزا
ابن امیر تیمور بسال هشت صد هفتاد و پنج هجری وفات یافت و در قصبه
خوسف من اعمال خراسان مدفون شده ۔

الحال که سال یکهزار هفتصد و هشتاد و نه عیسوی ست بحساب سال
هجری فوت ابن حسام" مصنف خاور نامه را سه صد و بست و هشت سال گذشته
و مجموعه ابیات خاور نامه بست و سه هزار هفتصد و سی و پنج بیت بشمار آمده
و مجموعه تصویرات این کتاب یکصد و پنجاه و بست صفحه ؟ اوراق است

دمجموعۂ اوراق ایں کتاب سہ صد و شصت و دو ورق است، واغلکہ ایں
کتاب بفرمائش بادشاہ یا امیر والاجاہ تیار شدہ باشد، کتبۂ علی ابراہیم خاں"
در سنہ ۱۷۸۹ء

کتاب میں کس قصہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کا ہیرو کون ہے؟ ان امور کی
صراحت آگے کی جائے گی،

جیسا کہ قبل ازیں میں نے لکھا ہے۔ "خاور نامہ دکھنی" اس فارسی خاور نامہ
کا ترجمہ ہے، جس کو رستمی نے بیجاپور میں کیا ہے؛
جہاں تک میرا خیال ہے، اس کتاب کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے
اس لحاظ سے اس کتاب کے متعلق جن جن اصحاب نے صراحت کی ہے، وہ اصل
کتاب کے علم کے بغیر صرف کیٹلاگون کے معائنہ سے کی ہے اور بعض جگہ قیاسات
کو بھی دخل دیا گیا ہے، جو واقعات کے خلاف ہوتا ہے، مثلاً بیان کیا گیا ہے
کہ اس میں محاربات حضرت علی علیہ السلام مذکور ہیں"۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا
جا سکتا ہے۔ کہ شاید حضرت علی رضؓ کی خلافت کے جنگوں کا ذکر ہوگا۔ حالانکہ
ایسا نہیں ہے،
رستمی کے تخلص کے متعلق یہی غلط فہمی ہوئی ہے، اور بجائے رستمی کے

"رسمی" خیال کیا گیا ہے، حالانکہ رستمی ہی صحیح ہے۔
یہ کتاب کس نے لکھی؟ کب لکھی؟ کیوں لکھی؟ ان امور کی صراحت میں آ
الفاظ میں کرنے کے بجائے، اس فارسی عبارت کو درج کرنا مناسب خیال کر
ہوں جو اسی کتاب کے آخر میں درج ہے اور جس کے مواد سے مرتبین کلیا
نے استفادہ کیا ہے :-

سبب منظوم کردن خاور نامہ دکھنی آں بود کہ علیا جناب خورشید نقاب
قدر افزائے دہیم عفت مسند آرائے کشور عصمت زینت بخش تجلیات مخدرات
مجلس آرائے حجرات طاہرات والا مراتب سمو مناقب خدیجہ سلطان شہر بانو
الملقب بڑی صاحب دامت عفتہا و عصمتہا کہ بصدق و تیقن و تیقن و
صدق خود را کنیزک پنج تن پاک حضرت بہترین انام پیشوائے انام معتدل
اکرام حضرت دوازدہ امام علیہ الصلوٰۃ والسلام و حضرت فاطمہ زہرا خدیجہ
کبریٰ و چہاردہ معصوم پاک کر . . . . . . درج شرفناک دیر نظم برج
لولاک اند خواند و صبیہ طیبہ شاہ گردوں بارگاہ قطب فلک عز و جاہ سلطان
محمد امین قطب شاہ ابن قطب شاہ است و خواہر سکوہ سیر شاہ گیتی پناہ کسری
کلاہ سلطان عبد اللہ قطب شاہ ابن قطب شاہ است و زوجہ شاہ سلیمان

بارگاه جم قدر سکندر سپاه خاقان فریدون فر قیصر الامنظر سلطان دین
پناه ابوالمنصور سلطان محمد غازی عادل شاه ابن ابراهیم عادل شاه است،
و والده صالحه ارشد ارجمند کامگار موید منصور بختیار قره ناصره دولت و اقبال غره
ناصیه حشمت و جلال سعادت مند ابدی و ازلی شاهزاده عالم و عالمیان شاه
علی عادل عمره را چنین بخاطر رسید که خاور نامه فارسی اگر بزبان دکنی منظوم شود
بهتر است پس فرمود . . . که این کتاب خاور نام را بزبان دکنی منظوم
کند او را بمراحم گوناگون شاهانه و عواطف بوقلمون خسروانه ممتاز فرموده، از ابنای
زمان و سخنوران دوران سرفراز گردانم، بنا بران محرمان سراپرده عظمت تخلص
بسیار و تردد بے شمار این مژده بهجت افزا و بشارت دل کشا به کمال خان ابن
اسمٰعیل خطاط خان دبیر که دبیر قدیم و منشی کرسی درگاه عدالت پناه است و
بزرگانش بخطاب خطاط خان نوازش یافته اند و طبع نقادش در فن شاعری
مهارتی تمام دارد و در سلک نظم و نثر در ناسفته را سفته آورده، در اشعار
تخلص خود رستمی کرده و در قصائد و غزلیات فارسی و دکنی بلاغت از حد برده
رسانیده اند (۹)

رستمی حسب الفرموده بلقیس زمان و موصوف اوصاف بیکران قبول

این معنی گشته رستمانه رخشِ فصاحتِ فارسی را بمیدانِ بلاغت دکھنی جولان
داده ہر بیت فارسی را به بیت بیت دکھنی انتظام داده نامش خاور نامه
دکھنی کرده از تائیدِ ربانی واز فیضِ سبحانی بست و چهار ہزار بیت در یک سال
و نیم تسوید نموده ترقیم و ترتیب کتاب نمود از توفیق الٰہی باتمام رسید،
امیدوار درگاہ مجیب الدعوات اندکه کارفرمائی این کتاب را از نخل
بخت و عمر برخوردار گردانید بمرادِ دل برساناد، مولف و نویسنده و سامعه
و خواننده را نیز از فضل خویش بی بہره نگذارد ٭

بیان مندرجه بالا سے بخوبی واضح ہے، کہ کمال خان کا تخلص رستمی صحیح ہے
نہ کہ رسمی جیسا کہ بعض اصحاب کا خیال ہے۔
اشعار میں بھی متعدد جگہ جہاں تخلص آیا ہے، وہاں رستمی ہی لکھا گیا ہے
چنانچہ کہتا ہے:۔

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر بولیا معجزہ یو کمال خان دبیر
خلق کہتی ہے مجھ کو کمال خان دبیر تخلص سو ہے رستمی بے نظیر

کیا رستمی اس وقت یو کتاب بندیا بات کی گوہران بے حساب

خاور نامہ دکھنی کیتا ہوں نام ہُوا خاورؔ ان پر قصہ سب تمام

وے ادمے جو ستی اچھے مجھ مدام کرے رستمی کون او عالی مقام

رستمی کے تخلص کے متعلق فیلن نے بھی دھوکہ کھایا ہے، مگر اس کا دھوکہ کھانا ناگزیر تھا، کیونکہ گارسی دی تاسی کا تذکرہ اس کے پیش نظر تھا جس میں رنمی مذکور ہے، اس پرنگر کے کیٹلاگ اور اسٹوارٹ (Stewart) کی کیٹلاگ میں یہ کتاب شریک نہیں ہے،

یہ کتاب جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے سلطان محمد عادل شاہ ابن ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں مرتب ہوئی ہے، سلطان کا زمانہ حکومت ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۷ھ تک ہے

محمد عادل شاہ اپنے باپ کے بعد مالکِ تخت وتاج بنا، باپ کی طرح یہ بھی ارباب کمال کا قدردان اور اہل علم کا سرپرست تھا، اس کے دربار کے شاعر حکیم آتشی نے خمسہ نظامی کا جواب لکھا تھا،

سلطان کے حکم سے نواب خاں بابا نے رفیع الدین حسین شیرازی کی کتاب احوال السلاطین دکن کو مکمل کیا، حکیم آتشی کے سوا ابراہیم خاں دوسرا مشہور شاعر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور مرد کس قسم کا لباس پہنا کرتے تھے، اس کا پتہ چلتا ہے، کہ بعض ڈاڑھی
صاف کرواتے تھے کسی کی مونچھ زیادہ لمبی ہوتی تھی، ہندو مرد دھوتی کا استعمال
کرتے تھے، ہندو عورتیں ساڑھی کو پیچھے ٹوپ دیا کرتی تھیں، مسلمان مرد لمبی
قبا تنگ آستین کی استعمال کرتے تھے بعض اوقات ایک نیم آستین قبا اس پر
ہوتی تھی، پائجامہ کبھی تنگ اور کبھی گھردار استعمال ہوتا تھا، عام طور پر عمامہ
باندھا جاتا تھا جس کو کبھی پہنے بھی ہوا کرتے تھے، جنگ کے وقت خود
استعمال ہوتا تھا، عورتوں کے لباس میں لہنگا دامنی اور چولی کا رواج تھا۔
پیٹ صاف طور پر نظر آتا ہے، آج تک جنوبی ہند (مدراس) میں غریب
مسلمانوں کا یہی لباس ہے ؂

مسلمانوں میں عام طور پر نماز اور عبادت کا دستور تھا، مذہب کو زندگی کا
جزو لاینفک تصور کرتے تھے، دعا مانگی جاتی تھی، اور اس کو اثر پذیر خیال
کیا جاتا تھا، امرا کے کھانے کے وقت ملازم تول سے مکھی اڑایا کرتے
تھے، مختلف کھانے ایک ساتھ دسترخوان پر چن دیئے جاتے تھے، صراحی
بردار پیچھے استادہ رہا کرتے، دوست ملاقات کے وقت بغل گیر ہوا کرتے
بادشاہ موسیقی سے بہرہ اندوز ہوتے، تخت کے ساتھ کرسی کا رواج تھا۔

ہلال، جو قنطار شاہ کی طرف سے آیا تھا، رعد، میر سیاف۔ قباد۔ ایلاق ترک اس کو سعد نے قتل کیا۔ میر زنہار خوار یہ مسلمان ہو گیا۔ شاہ پور، اس کو مالک نے قتل کیا، فرہاد، عمار، شاہ خاوران کی جانب سے آیا تھا کشیب، ہوما، نوشاد جمشید کی جانب سے حضرت علیؓ کے مقابلہ کو آیا تھا، اردشیر، یہ بھی جمشیدی تھا۔ آدم کوتوال شہر ربیع، اسفندار، بہمن اس کا مالک سے مقابلہ ہوا۔ اور قتل ہوا شدادِ کاموس، شیبان، شہپال، جادوگر، گلباد، ابوالمعجن سے مقابلہ ہوا، خفچان، قرطاس اس کو بھی ابوالمعجن نے قتل کیا، ارغوان کوہی، سمراق، پیل زور، ابوالمعجن کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سربال، صلصال شاہ کا سپہ سالار تھا، گوراب، گرزدرو، توزاد، کیو، عاد، نورادین، سام، یہ سب صلصال شاہ کے جنرل تھے اور اکثر قتل ہوئے۔

داستان میں عورت کا ذکر آنا ناگزیر ہے، چنانچہ اس مثنوی میں جن عورتوں نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

دل افروز، دختر نوادر، جس سے سعد نے بیاہ کیا، گل چہرہ، دختر جمشید شاہ پریرخ، زن جمشید، خواہر جمشید، گلنار، گل اندام، شمامہ صلصال شاہ کی ملکہ اس کے قتل ہونے پر مسلمان ہوتی ہے، قرطاس شاہ کے حرم، طہماس شاہ کی بہن،

ان بادشاہوں کے لشکروں کے سوا بعض اور لشکروں کا ذکر اور ان سے مقابلہ ہوا ہے، چند کے نام بیان کئے جاتے ہیں، لشکر آدمی خوار، لشکر دیوان لشکر پریاں، لشکر جادوگراں، لشکر کلاہان، لشکر فیل گوشاں۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے، یہ فرضی داستان ہے جس میں صدہا امور غلط اور ناممکنات سے ہیں، مثلاً دیووں، پریوں، بھوتوں سے جنگ کرنا، خلاف قیاس اژدہوں، شیروں، ناقیبوں سے مقابلہ طلسم کشائی اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں۔

یہ سب کچھ تو غلط ہے اور قصہ کی حقیقت صرف افسانہ ہی ہے، مگر جو امر قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمانہ سلف میں تبلیغ اسلام اور اشاعتِ دین محمدی کی ہر وقت دھن رہا کرتی تھی، اور وہ قصہ کہانیوں میں بھی اس کو نظر انداز نہیں کرتے تھے، خاور نامہ کے مطالعہ سے یہ صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنف کو تبلیغِ اسلام کا کیسا شوق تھا۔

نفس کتاب میں جن جن عنوانات پر بیان ہوا ہے، جن کی سرخیاں قائم کی گئی ہیں، اس کا اندراج طوالت سے خالی نہیں، بریں ہم بطور نمونہ چند درج ہیں، دکھنی خاور نامہ کی سرخیاں فارسی میں ہیں:—

۱۔ گفتار جمع آسمان

۲۔ گفتار در صفتِ آدم زاد و قدر و منزلتِ ایشاں۔

۳۔ فی المناجات۔

۴۔ صفتِ مدینہ۔

۵۔ صفتِ شب است دراصل میں فردوسی کی تعریف ہے،

۶۔ آغازِ داستان خاور نامہ

۷۔ صفتِ شب و خشم گرفتن ابوالمحجن وسعد وقاص رضؓ۔

۸۔ داستان با نوادر۔

۹۔ فرستادن نوادر سپاہ را بکارواں زدن۔

۱۰۔ داستان نوادر

اس تفصیل کے بعد اب دکھنی نظم کا نمونہ مختلف مقامات سے پیش کیا جاتا ہے، جس سے نہ صرف کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے، بلکہ شب کا سماں، جنگ کا سین، شب خون حملہ، بحری جنگ، دو شخصوں کا مقابلہ وغیرہ امور پر بھی کافی روشنی پڑ سکتی ہے،

ابتدائی کتاب

حمد

اول[1] جب کیا یو کتاب ابتدا	بندیا بات میں نقش نام خدا
جو صاحب ہے او عقل ہور جان کا	کیا دین بخشش او ایمان کا
او ہے ایک صاحب اپر ہور تلین	جو ہستی پر اس کی گواہیں ہمیں

فردوسی کی تعریف :-

جو شاعر تھا فردوسی پاک زاد	اچھو حق کی رحمت ہوں او بھوت شاد
دنیا میں ہوئی بات استی پند	ہوا شعر تھی بھی انی بہرہ مند
ہو شعر اس خوب آبے رواں	کیا از بچوانال کیا از خسرواں
کیا نامہ او خلق میں نام دار	رہیا جگ میں اپس تیج یو یادگار

اسی طرح چند شعر لکھنے کے بعد آخر میں کہتا ہے :-

اس یک بیت پر شبت اس کو دیا	ملک بات کا اس کو بخشش کیا
صفت بھوت توحید میں اس کروں	مگر میں بھی یک نکتہ ایسا کہوں

---

[1] چونکہ مجھے کوئی اور نسخہ اس کتاب کا دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے صحت کا موقع نہیں تھا اس لئے بجنسہٖ کلام پیش کیا گیا ہے۔

جو آپس نحتی تھی ہوئی دولت مجھے،
بلندی دیوی ہور رحمت مجھے

اصل قصہ کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے :-

جو مسجد میں اقصا کی بیت الحرام — رسولِ قریشی علیہ السلام
مبارک وقت کون جو یک نامدار — جو بیٹھے تھے مسجد میں اس وقت شاد
زبان کھول یاران آپس میں اپنے — تھورا بھوت ہر یک لگے بولنے
بولیا ایک جوان مالک نامدار — نہ ہوسی دنیا میں بھی دسرا سوار
بولیا بعد وقاص مجھ سار کا — نہیں کوئی مجلس میں مجھ کار کا
جوان ایک بوالمحجن اپس ناؤ تھا — جو مردی میں اس ناؤ سب تہانو تہا
ہنر کا دو اول میں روشن اتھا — ہنر سب او حیدر سے سکیا اتہا
اونچی ہور نچی بات آئی دربان — عمر جا بگی لے کر آیا وہاں

ایک شب کا سین ملاحظہ ہو:-

آیا تھا زمین پر بلی جون شاہ زنگ — زمین ہور زماں کون لیایا تھا پی تنگ

سفیدی پی کھینچی تھی نکہ پر نقاب — پرند سیہ پہنا تھا آفتاب

زمین پر عنبر کا منڈپ تھا تمام — سوا کون سراپردہ تھا مشکفام

زمین پر تو سنبل نتھا نہیں تھا سمن — کیا تھا پی سوسن کا کسوت چمن

کیا تھا محل کی بستر شاہ چین — صباحی کا تھا زاغ بھی خواب میں

زمین ہور زماں میں پی کاجل بھریا — انگار جا کر جگ میں دھواں بھر رہیا

جتی مرغ ماہی کون تھا بہوت خواب — زمین کون درنگ آسمان باشتاب

فلک نو طبق کو ہراں سوں سنوار
ہوا کون پی زیور کیا صد ہزار

شب زفاف کے متعلق صراحت دیکھو:۔

دل افروز ہور سعد کون واں لجا — کئے عقد دونوں کا سب لوگ جا

زن و مرد کا کام جوں سب ہوا — ابھی رات ساری محل میں ادجا

ستارے اتی جتنے سب رات کون — چھپی دیکھ کر اوجت کالی سون

عروس صبح کی جونکہ جلوا کری — فلک کی پی چرسے تھی بہار آبہری

علی بھی بولائی دل افروز کون — کہی اچہ توں اپن یو رنج ہی دل سون

ابوالمحجن اور رعد کا مقابلہ ملاحظہ ہو:-

آیا رعد اِس پر جا نو فیل مست　　چمکتی لیا رعد سپی تیغ دست
دو باگاں لڑکے لے کر شمشیر تیز　　زمین پر کئے آپس وقت ستیخز
مارے اس اپر ہر طرف تھی بی تیر　　سپر سوں کھیا وہانپ اپنا اوس پر
سپر کی ہلن بجلی دستی رتھی تیغ　　دستی بجلی جون ابر میں بید ریغ
غصّے سوں مارے زخم ہور یوں لٹے　　جو سر تھی سپر نگرے ہو کر اتری
جواناں کی بازو تھی شمشیر لون　　ہوئی تھی جو جو کان سپر کند جون
سوار رعد کی آپس تھی میدان میں　　ہوئی دیکھ حیران وو اس سب جتن
آخر کو ابوالمحجن نامدار،　　کیا سرا پر رعد کی تیغ باز
سپر لیا یا سر پر او جنگی سوار　　دو ٹکڑے ہوا او سر جون خیار
سپر کاٹ کر تیغ اتری ملار　　کالی ترک پولاد سر ایک بار
چلیا رعد کی سر تھی بھی لعل خون　　ہوا ترک پولاد سوں سر نگوں
ماریا گرم ہو غصّے سوں پہوان　　کاٹیا زین ہور سب تمام کستواں
اسی سر تھی بھی پالوں لک دو کیا
اس تیغ زین سوں بانڈیا

طاوے کی شمشیر لے ہات میں	سراں بہوت کاٹی اسی سات میں
بہت کوتیاں مالک لے گرز گراں	کاریا سراں کی بھی سرتھی واں
ہوا کالا واں دشت سب گرد تی	پچھانی نہیں اپسی واں مرد بھی
چمکتی تھی بجلی ہور تیغ واں	پستاری ہو دستیاں سنہاں ہاں
کالی رات ہور گرد ہور تیغ تیز	کھو اسپتی بھی کیسی رستخیز
شیخوں کا لشکر ہوا کہا برا	کیا خاوراں جھکڑت میں دل بڑا

دو فوجوں کا مقابلہ ملاحظہ فرمائیں :-

آئی درمیان سواراں تمام	اتھی ہات میں تیغ آئینہ فام
لی شمشیراں پر انوکھو لے دست	کئے مار کر سرفرازیکون پست
مارے تیغ جس سرا پر سرفراز	دو نیمہ کئے گھورا گھورا سوار
بہی جس گردن اوپر مارے تیغ کون	دو ٹکرا الیا سرنت سوا سرنگوں
دلیراں کی لہو تھی بدنستان اندروں	جون دریا میں موج ماری نجون
ہوئی جتنی اسپان پولاد نعل	دپی سم تہی دم لکا و در آب
تمام دشت و صحرا بری دست و پائے	چلے ان اپر سب جنگ آزمائے

خاور نامہ دکھنی کیتا نوں نام   ہوا خاوران پر قصہ سب تمام
اپس اوپر بہت گذریگا روزگار   اچھیگا یو دنیا میں ہور یادگار
نو اس نامی کون نامۂ شاہ جان
دوجی نامیان پر شاہ دلخواہ جان[1]

(معارف نامہ ۱۹۳۰ء)

علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی کا ہندوستانی کلیات

(سنہ ۱۰۶۷ھ تا سنہ ۱۰۸۳ ہجری)

یہ ہمیں معلوم ہے کہ بیجاپور کے آٹھویں حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی کا تخلص شاہی تھا اور وہ عموماً اردو زبان میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا، مگر آج تک اس کے کلام کے متعلق کافی تفصیلات سے آگاہی نہیں تھی۔

آج سلطان کے کلیات کا ناظرین سے تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ ہم کو برہان پور سے دستیاب ہوا تھا۔ اور اب وہ دفتر دیوانی و مال سرکار نظام (حیدر آباد) کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

---

[1] چونکہ ہندوستان میں اس مثنوی کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اس لئے کلام کا نمونہ کسی قدر زیادہ دیا گیا ہے +

نہیں کیا جا سکتا، لائق معلم اور قابل ترین مودب شہزادے کی تعلیم و تربیت پر مامور کئے گئے، آگے چل کر شہزادے نے ایک نامور ادیب، بلند پایہ شاعر قابل مدبر اور نبرد آزمائی میں آزمودہ کار جنرل اور ایک شاہ سرآمد روزگار کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا۔ تو وہ نتیجہ تھا ایک ایسی تربیت کا جو شاہی خاندان کے ارکان کو اقبالمندی کے عین شباب میں شاذ و نادر ہی میسر آتی ہے۔

باپ کے انتقال پر محرم ۱۰۶۶ ہجری میں انیس سال کے عین زمانہ شباب میں سلطنت کی باگ ہاتھ میں لی، درباری شاعر عبد النبی نے

نوبت شاہی زادہ بعد محمد علی

سے تاریخ نکالی۔

محمد عادل شاہ کے زمانہ ہی میں سلطنت عادل شاہی کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا تھا، علی نے جب حکمرانی کی باگ ہاتھ میں لی۔ تو اس نے اپنی سلطنت نہ صرف بیرونی مخالفوں میں گھر پائی۔ بلکہ خود ارکان حکومت، اور امرائے ملک میں بغض و عناد کی تباہ کن آگ شعلہ زن دیکھی۔ مغلیہ شہنشاہت کی پالیسی اب اس امر کی مقتضی تھی۔ کہ دکن میں بھی عظیم الشان مغل سلطنت کا خطبہ و سکہ چلنے لگے۔ شاہ جہان صاحب قران کی جانب سے اورنگ زیب

د۔ کلیات میں متعدد جگہ شاہی تخلص آیا ہے اور یہ معلوم ہے۔ کہ شاہی علی عادل شاہ ثانی ہی کا تخلص تھا۔

"روزے علی عادل شاہ مرزا آن کار اجنبو رطلبیدہ مدارت و عنایات بدو نمود و تکلف نمود کہ زبان را بمدح بادشاہ آشنا سازد' مرزان گفت زبانے را کہ درحمد و نعت و منقبت وقف گردیدہ در حکم من نماندہ بادشاہ مکرر تکلیف نمود ناچار یک دو مرثیہ بزبان سلطان گفتہ بجائے اسم خویش تخلص علی عادل شاہ کہ شاہی بود بہ قسمے داخل نمودہ۔ کہ ذو معنی واقع شدہ۔

بساتین السلاطین صفحہ ۴۳۳

ب۔ اشعارِ ذیل اس امر کا کافی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ کہ یہ علی عادل شاہ ہی کا کلیات ہے۔

تیرا یاد دن رات شاہی کا کاج ترے فیض سوں ہے اُسے تخت و تاج

(ص ۱۲)

منظفر علی شاہ کے ہات کا اچک تیر لاگیا نشاں کیے پلک

(ص ۱۵۸)

لاکھ سوں بھوں چپٹ توٹ سوں سیدسین بناوے بھید پڑ رنگ گت علی عادل سوک مرتضیٰ اب تر بجاوے

(ص ۲۱۹)

. . . .

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

. . . .

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زلیخا جیسی مثنویاں جو ہر زبان کے ادب کے لئے سرمایۂ امتیاز ہو سکتی ہیں۔ یہ سب بیجاپور میں لکھی گئی ہیں۔

شاہی کی ایک نامکمل طویل مثنوی بدیع الجمال ہو جو اس وقت دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کلیات میں بھی سلطان کی تین مثنویاں ہیں۔ جن میں سے ایک بہتر شعر کی مثنوی خیبر نامہ کے نام سے لکھی گئی ہے۔ دو اور مثنویاں سات سات شعر کی ہیں۔

خیبر نامہ میں جنگ خیبر کے حالات ہیں۔ زیادہ تر واقعات نہایت صداقت کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں، یہ مثنوی واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے، مختصراً انتخاب پیش ہے :-

ادل حق کی توحید سوں کر سخن ۔۔۔ پچھیں خوش ادا سوں بیان کر بچن
تجھے ہے سزاوار حمد و ثناء ۔۔۔ ترے حکم سوں ہے [illegible] ہیو ربڑا

. . . .

انا ایک قصہ سنوں جنگ کا ۔۔۔ کہ دو جنگ تھا دین کے ننگ کا
اتھا ایک خیبر کا قلعہ بکل ۔۔۔ بڑے بہر کلاں پر اکل تھے اٹل

. . . .

سلح ظاہری باطنی سوں سنوار   عنایت کئے شاہ کوں ذوالفقار
روانا ہوئے جنگ کے لئے نامدار   دو شاہ ولایت اودھک کام گار
چلے شہ وہیں کفر کوں توڑنے   او جا سٹ پتھر کے تبان پھوڑنے

. . . .

جو مرحب نے دیکھا برادر کتین   کھیا دو گیا تو لڑ مل گاج میں
زرہ باندھ دو دہری بندھا دو فرنگ   رکھیا دل میں جب شہ سوں کرنے پلنگ
لیا ہات بھالا جو تھا تین من   شتابی سوں آ کر کھڑا بیچ رن
جو دیکھا نظر بھر شہنشہ کا موں   دو بولیا سخن بوا بس لوچ سوں
کر سپنے میں دیکھیا ہوں میں رات شیر   کیا پھاڑ پنجے سوں آپس کوں زیر
دہی شیر دستا ہے مج آج یو   غصے سوں کریگا مگر دہر کوں رد
شہنشہ نے مرحب کوں بگی بلک   دو شق کر سٹے سیس تھی پا تلک

. . . .

یہودی ہتے تھے ہوئے سرنگوں   غنیمت لگی ہات حد سوں فزوں
فتح کر قلعے کوں شہنشاہ سور   پھرے لیکے لشکر پیمبر حضور
پیمبر خبر سنکہ خوش حال دل   ہوئے توانگے آ علی شہ سوں مل

. . . .

تیرا یا دن رات شاہی کا کاج
ترے فیض سوں اُسے تخت و تاج

ایک دوسری مثنوی بھی ملاحظہ ہو:—

سونے کی صراحی سونے کا ہے جام ۔ سونا گھول پتی ہے بھر بھر مدام
چندر مکھ سکی کا ادھک پیار کا ۔ سونے کا ہے سیس پھول اُبج سار کا
سونے کیاں کلیاں کر کراں میں پڑی ۔ سونے کی زنجیر گلے میں دھری
سینا ہے سکی کا سونے سار کا ۔ سونا ہور موتی گلے ہار کا
سونے کا زرنیا سونے کا ہے انگ ۔ سونے کا ہے ٹیکا سونے کا ہے پلنگ
سو وہ جب سنواری ہی پچن کا نگ ۔ سونا اُسرن لک دھریا سیس پک

کرم تج پہ شاہی کا دستا ہے آج
سونے کا انجل ادت کرتی ہے لاج

غزل۔ سعدی و حافظ کی فارسی غزل خوانی کے بعد ہندوستان میں غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا، اور ظہوری و کلیم نے جو زمزمہ خوانی کی، اس کی آواز باز گشت میں رستمی، نصرتی، ہاشمی وغیرہ نے اپنا زور قلم صرف

کیا، اسی طرح شاہی کا کلیات بھی غزلوں سے خالی نہیں ہے، جن کی تعداد (۱۸) ہے، ان کے اشعار کی تعداد پانچ سے چودہ تک ہے، اشعار کی کل تعداد (۱۳۹) ہے، نمونہ ملاحظہ ہو۔

جس دن ستے تمن سات لگیا من را ہمارا
اس دن ستے پرت کا ہوا مج تن میں پکارا

جس زلف و گال کے اگیں شام و سحر کو ہو،
تس روپ کے پرکھنے کو حد بشر کو ہو

تج نین کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو
یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کی سمدر ہے

تج گال پر نگ کا نشان دستا ہے مج اس ہاتھ کا
روشن شفق جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

چل خوش سہانے کمان کے اوپر   کمان پہنی سے چلا ہے الگ
مظفر علی شاہ کے ہات کا   اچک تیر لاگیا نشان کے بگ

ابرو کمانان کھینچ کر مارے پلک کے تیر سون
زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشان تج ہات کا

تج بال کالے دیکھ کر بادل پھریں حیران ہو
تج بھال ہور نیلک کنے کیا چاند ہور کیا سور ہے

ریختہ ۔ شمالی ہند میں ایک زمانہ تک اردو زبان ہی کا نام ریختہ تھا اور پھر نظم کو بھی عام طور سے ریختہ کہا جاتا تھا، بخلاف اس کے دکن میں اردو زبان کو کبھی ریختہ نہیں کہا گیا اور نہ عام طور سے نظم کو ریختہ کا نام دیا گیا، البتہ ولی کے زمانہ سے نظم ریختہ کے نام سے بھی موسوم ہونے لگی یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو   رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند
ہمارا خیال ہے ۔ ولی نے بھی اس کو شمالی ہند کے سفر کے بعد ہی اختیار

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

١٧٠١ ھ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ١٧٠١ ھ [illegible]

[illegible] ١٧٠١ ھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پہلی۔ اس کلیات میں دو ایک پہلی بھی مذکور ہیں۔ ناریل کی پہلی حسب ذیل ہے :۔

میانے ملائی بہتر رس   آس پاس بھبوت دس

سلطان علی عادل شاہ کے کلام کا نمونہ جو مختلف اصنافِ سخن میں ہے پیش ہو چکا ہے۔ اس سے سلطان کی قوتِ بیان اور ذوقِ سخن کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس کے قصیدے جہاں ادق اور مشکل بحروں میں ہیں، وہاں آسان اور سہل بھی ہیں۔ زورِ بیان شوکت لفظی اور شاہانہ طمطراق کا ان قصیدوں سے کافی اظہار ہوتا ہے، مثنویوں سے واقعہ نویسی اور مرقع نگاری کی تصدیق ہوتی ہے، محل سراؤں اور شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کوئی کمی نہیں تھی، رخساروں کی گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے اٹھو پہر لطف اندوز ہونے کا پورا ساماں مہیا تھا۔ اس لحاظ سے شاہی کی غزلیات میں حقیقت کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ ساتھ ہی رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرین تخیل کی پرواز کو ظاہر کرتی ہیں، تشبیہ اور استعارہ کو بھی کام میں لایا گیا ہے، اگر وہ بھی عام فہم، اس کے عاشقانہ کلام کو اگر زمانۂ مابعد بلکہ آج

کل کے کلام سے ملایا جائے تو زیادہ فرق سوائے زبان کی صفائی اور تخیل کی پرواز کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

معشوق کی وہی زلفِ سیاہ، رخسارِ گلگوں اور چشمِ فتاں کی تعریف ہے اس کی ترچھی نظر سے عاشق گھائل ہوتا اور تیرِ نظر سے اس کا دل مجروح ہو جاتا ہے۔ شرابِ ناب سے سیری نہیں ہوتی، معشوق چاند سے زیادہ حسین، شمع سے زیادہ روشن ہے، اس کا حسن سمندر کی طرح بے پایاں گیسو شام کی طرح سیاہ، گال سحر کی طرح سپید ہیں۔

کبھی معشوق اپنے عاشق کے ساتھ جانے کے لئے بے قرار ہے، اس کو جدائی اور فراق کے زمانہ میں نیند نہیں آتی، دن کو چین ملتا ہے اور نہ رات کو آرام، پیا کے سوا کوئی ساتھی نہیں، دل لہو کے تیل میں تپتا اور موم کی طرح جلتا ہے اور وہ جدائی کے صدمہ سے گھل کر دبلی ہو جاتی ہے، کوئی اس کے حال کو سننے والا نہیں، اس کے آنسو موتی کے طرح نکلتے ہیں جدائی میں ایک ایک پل سال معلوم ہوتا ہے، عاشق کے بغیر دکھ بھاری اور دنیا اندھیری ہے۔

اس طرح کے خیالات اور مضامین وہی ہیں۔ جو شعرائے مابعد کے کلام

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جس اسلامی سوسائٹی نے ہندوستان اور دکن میں نشو و نما پائی۔ اس کا اصلی سرچشمہ ہندوستان سے باہر وسط ایشیا اور ایران میں واقع تھا۔ بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی زمانہ کی تاریخ ادبیات کے اکثر پہلو ایران و وسط ایشیا کی تاریخ ادبیات سے مربوط ہیں، اس لحاظ سے جب دکھنی ارباب ادب نے فکر و تخیل کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہا۔ تو ان کے سامنے فارسی شاعری کا پیکر موزوں موجود تھا دکھنی شاعروں نے بھی فارسی مثنوی، فارسی قصیدہ اور فارسی غزل کا چربہ اتارنا شروع کر دیا

ہمارے عام قومی انتشار اور پراگندگی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہماری عام قومی زبان کی تاریخ تاریکی اور گمنامی کے پردوں میں اوجھل ہو گئی ہے، ہماری زبان کے ایسے شاہکار جن پر ہر زبان ناز کر سکتی ہے۔ خود ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ یہ کتنی بدقسمتی ہے۔ کہ آج ہم اپنی زبان کی تاریخ یا عہد بہ عہد ترقی کی کوئی مسلسل روئیداد مرتب نہیں کر سکتے

بہرحال جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ دکن میں ولی سے پہلے اردو نظم کی ابتدا کب ہوئی اور کن حالات میں ہوئی۔ تو ہمیں اس کا کوئی صحیح علم نہیں ہوتا؛

جو مواد ہمارے پاس موجود ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ جس،

[illegible]

[illegible] ١٠٤٤ [illegible]

[illegible] ١٠٥١ [illegible] ١٠٧١ [illegible]

[illegible] ١٠٧٨ [illegible] ١٠٨٨ [illegible]

[illegible]

جن میں عاشقی کی کتھا بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظامی کی مثنوی کے بعد ان مثنویوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو بیک نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ نہ صرف اسلوب بیان بلکہ زبان کی سلاست نے بھی آب ترقی کی کئی منزلیں طے کر لیں۔

ان تمام مثنویوں پر تفصیلی تبصرہ کافی وقت کا محتاج ہے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہوگا۔ کہ قطب مشتری میں خود بادشاہ وقت سلطان قلی قطب شاہ کی روداد محبت کو شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ جو بھاگ نگر کی ایک حسین رقاصہ بھاگ متی کے عشق کا نتیجہ تھا غواصی کی مثنویاں سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کو ایک کامیاب ترجمہ قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، غواصی نے ہندی الفاظ کو بڑی عمدگی سے دکنی زبان میں آمیز کیا ہے، کلام بہت سادہ اور تصنع و آورد کی قید و بند سے آزاد ہے۔

غواصی سے گزر کر ابن نشاطی کی پھول بن پر نظر ڈالیں۔ تو پچیس سال کے اندر ایک بڑا انقلاب نظر آتا ہے، جذبات کی حقیقی تصویر لفظی اور معنوی صنائع بدائع کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔ پوری مثنوی مرصع ہے، لیکن واقعی یہ

تجاز سخن ہے کہ سلاست اور روانی بڑی کوشش سے برقرار رکھی ہے۔

اسی زمانہ کی ایک دوسری مثنوی "گلشن عشق" نصرتی کے سحر نگار قلم کی ایک دائمی یادگار ہے' اس مثنوی میں انسان کے حقیقی جذبات کو جس خوبی سے قلم بند کیا ہے۔ اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔

عاشقانہ جذبات کا اظہار صرف مثنوی کی حد تک ہی نہیں رہا۔ بلکہ اس کا اثر غزل کی لطیف تر زمین پر بھی جلد پڑ گیا

سعدی اور حافظ کی فارسی غزل گوئی کے بعد ہندوستان میں غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا اور خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم نے جو زمزمہ خوانی کی اس کی آواز بازگشت میں دکنی شعرا نے بھی اپنا زور قلم صرف کیا اور داد سخنوری دی ہے جو مواد ہمارے پیش نظر ہے، اس کے لحاظ سے بظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ولی سے پہلے اس میدان میں دکنی شعرا نے اپنی یادگاریں بہت کم چھوڑی ہیں دکنی شاعری کے سلسلہ میں جو عظیم الشان ذخیرہ مثنوی اور مرثیہ کی صورت میں دستیاب ہوا ہے۔ اس کے مقابل غزلوں کی مقدار بہت کم ہے، سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور کے سوا دوسرے نامور شعرا، وجہی، غواصی، نصرتی، شوقی، ہاشمی وغیرہ

ان غزلوں میں رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پروازی، خیالات کی جدت، تشبیہ و استعارات کی لطافت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

رزمیہ شاعری۔ دکنی شاعروں نے جہاں عشق کی حکایات لذیذ کو صفائی اور ندرت سے بیان کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، وہاں جنگ و پیکار کی دار و گیر کو بھی نہایت سلیقہ اور ہنرمندی سے مرتب کیا ہے، اس قسم کی مثنویوں میں رستمی کا خاور نامہ (۱۰۵۹ھ)، شوقی کا فتح نامۂ نظام شاہ (سنہ ؟ھ)، سیوک کا جنگ نامہ (۱۰۹۲ھ)، لطیف کا ظفر نامہ (۱۰۹۵ھ) بہت سرآمد ہیں۔

رستمی کے خاور نامہ کو دکنی ادب کا سر سبد گل کہنا بجا ہے، چوبیس ہزار شعر کی ضخیم مثنوی صرف اٹھارہ ماہ کی قلیل مدت میں لکھ ڈالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، گو یہ مثنوی ابن حسام کی تالیف کردہ ایک فرضی داستان خاور نامہ کا دکنی ترجمہ ہے لیکن اس کی وجہ سے رستمی کا پایہ کچھ کم نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح ظفر نامہ اور جنگ نامہ دونوں غالباً ترجمے ہیں۔ البتہ شوقی کا "فتح نامۂ نظام شاہ" خود اس کی ذاتی محنت کا ثمرہ ہے۔ اس مثنوی میں اُس یادگار معرکہ کی روداد قلم بند کی گئی ہے، جو تلی کوٹ کے میدان میں مہاراجہ بیجانگر کے مقابل اسلامی

سلطنتوں کی صف آرائی کی بنا پر وقوع پذیر ہوا تھا۔

نصرتی کے قصیدے بھی رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ واقعات جنگ، صف آرائی کی تفصیل، لڑائی کا سماں، باجوں کی آواز، توپوں کی گرج، ہتھیاروں کی جھنکار، دشمن کی زاری وغیرہ امور کی جو کامیاب مرقع نگاری کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اسی کے ساتھ شوکت لفظی نیز کی بہت تسلسل بیان قابل قدر ہے۔

تاریخی شاعری: تاریخ و سوانح کے لئے نثر ہی موزوں ہے لیکن نوبہ جیسی اس کو بھی نظم میں بڑی کرامت کیر موقع ہے۔ دکنی شاعروں کی ایسی مثنویاں بھی مقررہ معیار پر کامیاب اتر سکتی ہیں۔

نصرتی کا علی نامہ ([illegible]ھ) اور تاریخ اسکندری (۱۰۸۴ھ) اور مومن کی اسرار عشق (۱۰۴۳ھ) اس طرح کی ممتاز مثنویاں ہیں۔ علی نامہ میں علی عادل شاہ ثانی کے اہم [illegible] ان میں جو فتوحات کے تھے وہ سب [illegible] دونوں کو اس کتاب میں مناسب طرح آمیزش دی گئی ہے۔ وہ نصرتی کے [illegible]

طرح نمایاں کرتی ہے، نیز اس وقت کے رسم و رواج، طور و طریق، عادات و اطوار کو کافی طور سے واضح کرتی ہے۔ غرض معاشرت کا ہر پہلو صاف طور سے پیش نظر ہو جاتا ہے۔

نیچرل شاعری۔ شمالی ہند میں غزل گوئی کی زمین جس طرح پامال ہوئی اور وہاں کے شعرا کی فکر زلف و گیسو میں جس طرح اُلجھ گئی۔ اس کی بنا پر عام طور پر یہ خیال ہے کہ اردو شاعری نیچرل شاعری کے بازار میں تہی مایہ ہے اور اب عام خیال یہ ہے کہ جدید اُردو شعرا نے اس موضوع میں جو ساز چھیڑا ہے۔ وہ در اصل مغربی مضراب کا ہی ایک سُر ہے۔

لیکن یہ تفنہ بھی اب ایک تقویم پارینہ کا مصداق ہے۔ دکنی شعرا کی مشق سخن اس موضوع میں بھی کسی طرح شرمندہ نہیں ہے، مناظر قدرت سے طبیعت میں جو سرور پیدا ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی اچھے نظم نگار کی نظم میں منعکس نہ ہو۔ تو تعجب کا مقام ہوگا۔

سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے کلیات میں پھول پھل، ترکاری، باغ حوض، محل، چاندنی رات وغیرہ جیسے حالیہ موضوعات پر کئی مثنویاں اور قطعے موجود ہیں اور یہ کسی طرح پست معیار کے نہیں ہیں۔ نصرتی کا قصیدہ جو موسم

سرمایہ لکھا گیا ہے۔ ہر طرح قابلِ ستائش ہے اسی طرح دسوپ کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ نصرتی کی قادر الکلامی کا شاہد ہے۔

صوفیانہ شاعری۔ کسی اسلامی قوم کی زبان میں شعر لکھے جائیں۔ تو اس میں تصوف و سلوک کو بھی ایک خاص موضوع قرار پانا اب نہیں تو پہلے بہت ضروری تھا، دکنی زبان کے ارتقا کی ایک خصوصیت امتیازی یہ ہے۔ کہ فقرا و مشائخ طریقت نے بھی اس کی غور و پرداخت میں اپنا وقت صرف کیا ہے۔ لامحالہ خود دکنی شاعری میں تصوف و سلوک بھی ایک خاص موضوع قرار پاگیا خواجہ بندہ نواز، میراں جی شمس العشاق شاہ برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ قادر، شاہ من عرف وغیرہ جیسے صاحبانِ طریقت نے اپنے کلام میں سلوک اور تصوف کے کئی دقیق مسائل حل کئے ہیں۔

قصائد۔ انسان کے جذبۂ شکر گزاری نے شاعری کی زبان میں اپنی جو روئداد بیان کی ہے، وہ ہر زبان کے ادب کا ایک زیور ہے۔ دکنی قصائد بھی دکنی ادب کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ کئی شعرا نے قصائد لکھ کر اپنا زورِ بیان دکھایا۔ مگر افسوس ہے کہ جس ذخیرہ کا ہم کو اب تک پتہ چلا ہے۔ اس میں صرف چند ہی ایسے خوش نصیب شعراء

قطب شاہ، ظل اللہ اور عبداللہ شاہی اور نصرتی ہیں۔ ان میں سے بھی اوّل تین شعراء کے قصیدے عام طور پر دستیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ علی عادل شاہ شاہی اور نصرتی کے قصیدے قابلِ ذکر ہیں۔

یہ قصائد فارسی قصیدوں کی طرز پر لکھے گئے ہیں، وہی تشبیب وہی گریز، وہی مبالغہ آمیز مدح ممدوح اور وہی دعا۔ لیکن ہر شاعر نے دکنی ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ جدت ضرور پیدا کی ہے، شاہی کے قصائد کا زورِ بیان الفاظ کی شوکت، شاہانہ طمطراق داد کے قابل ہے۔

نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے قصیدہ کے پیرایہ میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے اور پھر جوشِ خیالات کی جدت تشبیہ اور استعارات کی ندرت یہ سب حق یہ ہے۔ کہ زندگی جاوید کے مستحق ہے۔

مرثیہ۔ شاعروں کے جذبات شکر گزاری نے جس طرح قصیدہ کی صورت اختیار کی۔ اسی طرح حسرت اور غم نے مرثیہ کا ڈھنگ اختیار کیا، دکنی مراثی آج بھی رولا سکتے ہیں، افسوس ہے کہ چند مرثیوں کے علاوہ اس صنفِ ادب پر بھی اب تک تاریکی چھائی ہوئی ہے ۔

قدیم سے قدیم جو مرثیہ ہم کو دستیاب ہوا ہے۔ وہ وجہی کا ہے شعرائے گولکنڈہ کے منجملہ قطب شاہ ظل اللہ، عبداللہ، وجہی، غواصی، لطیف، میوا مرزا وغیرہ کے مرثیے دستیاب ہو چکے ہیں، اور شعرائے بیجاپور کے منجملہ شاہی، نصرتی، ہاشمی اور مرزا وغیرہ کا نام مرثیہ نگار کی حیثیت سے قابل تذکرہ ہے ہم نے کئی مضامین کے ذریعہ اس صنفِ ادب پر بحث کی ہے، اب یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

دکنی شاعری کے خصوصیات۔ اس ساری ساحت کے بعد دکنی شاعری کی بعض خصوصیتوں پر سرسری طور سے کچھ کہنا ضروری ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں شمالی ہند کی شاعری کا موضوع زیادہ تر صرف حسن و عشق، شاہد و ساقی، گل و بلبل کے محدود دائرے میں گھوم کر رہ گیا۔ لیکن ہماری دکنی شاعری نے صرف حسن و عشق کی داستان نہیں بیان کی بلکہ جہاں اس نے حسن و عشق کے بہترین جذبات اور خیالات کے موتی پروے۔ وہیں اخلاق اور تصوّف کا گراں بہا سرمایہ بھی مہیا کیا اگر ایک طرف رزمیہ شاعری اور تاریخی واقعہ نگاری کا ذخیرہ موجود ہے۔ تو دوسری طرف مرثیہ گوئی اور مناظر نویسی کا وافر مواد موجود ہے، معاشرت اور تمدن

کے متعلق بھی میدان خالی نہیں ہے۔ مضامین کی یہ گوناگونی دکنی شاعری کی اولین خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت زبان کی سادگی اور عام فہمی ہے، دکنی شاعری کو شروع سے آخر تک دیکھ جایئے۔ مشکل اور ثقیل لغات اس میں نہیں دیئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے لفظی خزانہ کو ایک گنج نامحدود کی صورت حاصل تھی۔

قدیم دکنی شاعری کی تیسری خصوصیت اس کے عمدہ تشبیہات اور لطیف استعارات ہیں، بڑی بات یہ ہے کہ تشبیہہ اور استعارے سب زیادہ تر اپنے ماحول سے ماخوذ ہیں۔

خاتمہ۔ یہ خصوصیات اہم اور قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ دیگر خصوصیات بھی ہیں۔ جن کا اظہار طوالت کا موجب ہوگا۔

مگر یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے اسلامی علوم اور آداب میں انحطاط شروع ہو چکا تھا، اصابت فکر و رائے کا ٹوٹا پڑ چکا تھا۔ شرح اور حاشیہ کی گردش میں ارباب علم و فن سرگرداں تھے، قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلیٰ جذبات کی نشو و نما اس زمانہ کی شاعری کی دسترس سے بالکلیہ باہر

تھی، اس لئے اس وقت کی شاعری میں اس امر کی تلاش کہ انھوں نے زندگی کی بھلائی اور اخلاق عامہ کی بہتری اور زندگی کے لئے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کرنے میں کیا نقطۂ نظر قائم کیا تھا۔ تو محض فضول ہے۔

اس زمانہ میں کسی شاعر کو بلند پایہ قرار دینے کا معیار غالباً صرف یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے اپنی محدود چہار دیواری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اور فن کے پرکھنے کے جو ظاہری اور رسمی قواعد مقرر ہو گئے تھے، ان پر اس کا کلام کس حد تک پورا اترتا ہے۔

اس اصول کے تحت اگر ہم قدیم دکنی شاعری کا جائزہ لیں۔ تو ہم کو ناکامی نہیں ہوتی۔ بیسیوں شاعروں کا کلام بلاشبہ اقران و امثال میں بہت بلندی پر نظر آتا ہے۔

(الموسیٰ حیدرآباد)

کتابت ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۲۴ جلوس محمد شاہ (۱۱۵۵ھ)، اس میں ۳۷۶ غزل سے زیادہ ہیں، کیونکہ بعض حاشیہ کی تعداد شامل نہیں کی گئی ہے۔ اس کے بعد دس رباعی (۴۶) فرد، دو مستزاد، دو بازگشت، دو ترجیع بند، ایک چار در چار ایک مثلث، سات مخمس، اس کے بعد پھر تین مستزاد، دو قصیدے اور ایک مثنوی درج ہے۔

اس نسخہ میں جابجا الفاظ کی اصلاح کی گئی ہے مثلاً "کہتا ہوں" کو "لکھتا ہوں" بنایا گیا ہے وغیرہ حاشیہ پر متعدد اشعار زیادہ کئے گئے ہیں، اس دیوان پر دو مہر ہیں، ایک میں (محمد عبداللہ ولد حافظ محمد احمد ۱۱۸۶ھ) اور دوسرے میں محمد احمد ۱۱۶۸ھ مرقوم ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دیوان اُن کی ملک رہا ہے۔

اس میں دیگر اصحاب کے متعدد فارسی شعر بھی درج ہیں اور بعض خانگی یادداشتیں بھی ہیں، بعض اندراجات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ گجرات میں مرتب ہوا ہے، اس دیوان کا کاتب محمد نورالدین علی ہے۔

(۳) دیوان نمبر ۱۵۵ ورق (۱۳۴) سائز ۸½×۴¾ سطر ۱۱ تا ۱۵ خط نستعلیق
تاریخ کتابت ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ کاتب محمد تقی ولد سید ابوالمعالی [illegible]

بزرگ ہیں جن کے ساتھ ولی نے دہلی کا سفر کیا تھا۔

اس دیوان میں اول (۳۸۸) غزل اس کے بعد چار قصیدے، ایک ترجیع بند، پھر ایک قصیدہ، نو مخمس (۲۶) رباعی (۲۹) فرد۔ تین مستزاد، پھر ایک ترجیع بند، اور آخر پر ایک اور قصیدہ درج ہے، ابتدائی اوراق خوشخط میں اس کے بعد زشت خط ہو گیا ہے۔

اولاً بسم اللہ کے ساتھ بیس غزل ردیف الف کی خوشخط درج ہیں، اس کے بعد ایک صفحہ پر چند دیگر فارسی اشعار لکھے گئے ہیں، اس کے بعد پھر بسم اللہ کے ساتھ غزلوں کی ابتدا ہوئی ہے، کچھ تو مکرر درج ہوئے ہیں، اور کچھ نہیں ہیں، دیوان کے آخر علاوہ دیگر فارسی اشعار کے فراقی کی ایک غزل اور ایک عربی دعا مرقوم ہے، کتابت کے بعد مقابلہ کیا گیا ہے، جا بجا اصلاح اور حاشیہ پر الفاظ درج ہیں، اس دیوان کے سرورق پر درج ہے۔

"تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکن۔"

اور آخری صفحہ پر مرقوم ہے:۔

"تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان میاں ولی محمد مرحوم متوطن دکن تاریخ دویم شہر ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ بروز پنج شنبہ بوقت صبح تحریر یافت مالک و

کاتب ایں دیوان عاجز المذہب محمد تقی ولد سید المعالی است کسے
دعویٰ کند باطل است۔

(۴) دیوان نمبر ۱۱۶، ورق (۱۱۶) سائز ۸ × ۵ سطر ۱۳ تا ۱۷، خطِ نستعلیق، تاریخ کتابت اور نام کاتب وغیرہ کی صراحت نہیں ہے۔ مگر کاغذ اور خط کے مدِنظر اس کو بھی بارہویں صدی ہجری ہی کا تصوّر کرنا چاہیئے۔

اس میں اول چار قصیدے، ایک قطعہ، اس کے بعد دو مثنویاں درج ہیں اس کے بعد ایک صفحہ خالی چھوڑ کر غزلوں کی ابتدا کی گئی ہے۔ جن کی تعداد (۱۴۴) ہے، اس کے بعد تین مستزاد، دو ترجیع بند (۲۳) رباعی، چالیس فرد، ایک قطعہ، اس کے بعد پھر تین غزل اور پھر ایک قصیدہ درج ہے، اس کو بھی جعلی سے جوڑا گیا ہے۔

اس دیوان پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کالج کی ملک رہا ہے۔

(۵) دیوان نمبر ۱۱۷، ورق ۱۰۶، سائز ۹½ × ۵½ سطر ۱۱ تا ۱۴، خط نستعلیق، تاریخ کتابت درج نہیں، اس میں (۲۲۱) غزل، گیارہ رباعی، چار مستزاد، تین مخمس، ایک بازگشت، ایک چار در چار، ایک مثلث، ایک ترجیع بند اور دو قصیدے

درج ہیں، دیوان کے آخر حسب ذیل عبارت درج ہے :-

"چہاردہم جزو دیوان ولی برحسب فرمودۂ بہ جو کرج جیو سلمہ اللہ تعالےٰ بخط

ناپختہ (؟) خادم بروز دسرہ اتمام یافت"

۶۔ دیوان نمبر ۱۱۸ ورق ۸۵ سائز ۶ × ۸¾ سطر ۱۱ تا ۱۳ خط نستعلیق،

تاریخ کتابت، نام کاتب وغیرہ درج نہیں ہے بہ لحاظ کاغذ اور خط تیرھویں

صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے، اس میں ۲۷۰ غزل، دو مستزاد۔ دو مخمس درج ہیں

۷۔ دیوان نمبر ۱۹، ورق ۱۰۷ سائز ۶ × ۹¼ سطر ۱۱ تا ۱۴ خط نستعلیق، یہ دیوان

ناقص اول اور ناقص الآخر ہے۔ اس لئے تاریخ کتابت وغیرہ معلوم نہیں

ہوسکتی، بہ لحاظ شان خط و کاغذ بارہویں صدی ہجری کا ہے۔ اس میں ۱۴۱ غزلیں ہیں

۸۔ دیوان نمبر ۱۲۰، ورق ۴۷، سائز ۷ × ۱۲ سطر ۱۱ تا ۲۱ خط نستعلیق، تاریخ کتابت

۲۷ ذالحجہ سنہ ۱۲۸۰ کاتب غلام محمد۔

اس دیوان میں ۳۵۱ غزل ایک مستزاد۔ ایک مخمس، ایک ترجیع بند درج

ہیں، یہ دیوان ولایتی عودے کاغذ پر لکھا گیا ہے، پہلے صفحہ پر حسب ذیل عبارت

درج ہے :-

"کتاب ہذا حسب فرمائش جناب سیٹھ صاحب بروزجی سراب جی الیسرن

سنہ ۲۲ جلوس محمد شاہ ۱۱۵۳ھ۔

اس دیوان میں ۲۴۱ غزل، تین مستزاد، ایک بازگشت، ایک مخمس، دو ترجیع بند، چار قصیدے، ایک قطعہ، دو مثنویاں، ۲۲ رباعی ۱۲ فرد درج ہیں، خاتمہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

"دیوان ولی بحسب فرمائش رفعت و عوالی پناہ خانصاحب مہربان محمد نثار (نثار؟) چہو مرقوم شد بست و ششم شہر صفر سنہ ۲۲ محمد شاہ۔

اس دیوان کو بھی لکھنے کے بعد مقابلہ کیا گیا ہے، اکثر اشعار وغیرہ حاشیہ پر بنائے گئے ہیں، اس دیوان کی ایک خصوصیت یہ ہے، یہ گارسی ڈی ٹاسی کی ملک رہا ہے (Garcin - de - Tassy) کیونکہ اس کے دستخط موجود ہیں، جلد قدیم ہے، ممکن ہے۔ کتابت کے زمانہ کی ہو۔

۱۲۔ دیوان کتب خانہ کنگ کالج کیمبرج نمبر ۱۶۴، ورق ۹۱ سائز ۶ x ۱۰، ۱۴ سطر ۱۴۔ خط نستعلیق، تاریخ کتابت وغیرہ درج نہیں ہے، سرخ جدول ہے بلحاظ شان خط تیرھویں صدی ہجری کا ہے، صرف غزل ہیں جن کی تعداد ۳۲۲ ہے۔

۱۳۔ دیوان کتب خانہ کاپر کالج کیمبرج (Copper College) نمبر ۴ سائز ۵ x ۱۰، ورق ۹۱، ۱۵ سطر، ۱۷ تاریخ کتابت ۲۵ ربیع الاول سنہ ۱۲۱۲ھ کاتب

آتما رام خط نستعلیق۔

اس میں ۲۴۷ غزل، دو مستزاد، چار رباعی، ایک ترجیع بند، تین مخمس درج ہیں، دیوان کے آخر حسب ذیل عبارت درج ہے :۔

"بخط بندہ احقر آتما رام بتاریخ ۲۵ ربیع الاول سنہ ۴۲ مطابق ۱۲۱۲ھ روز جمعہ وقت دو پہر شاہ عالم بادشاہ غازی۔"

۱۴۔ دیوان کتب خانہ اکسفرڈ یونیورسٹی نمبر ۴۶ E ورق ۱۲۵ سائز $5\frac{5}{8}$ × $4\frac{3}{4}$ سطر ۱۱ تا ۱۵ خط نستعلیق، تاریخ کتابت وغیرہ درج نہیں مگر کاغذ اور نشان خط کے لحاظ سے بارھویں صدی ہجری کا ہے، اس میں ۳۴۷ غزل مگر ۲۱۳ غزل کے بعد درمیان میں ایک مستزاد اور ایک بازگشت درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد باقی غزل درج ہیں۔ غزل کے ختم پر جو صفحہ ۱۰۱ پر ہوئی ہے "تمت تمام شد دیوان ولی" لکھا گیا ہے اور اس کے بعد دس مخمس، ایک ترجیع بند پانچ قصیدے اور پھر ایک ترجیع بند، ۲۶ رباعی، بیس فرد درج ہوئے ہیں حاشیہ پر بعض الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں اور بعض جگہ اشعار اضافہ کئے گئے ہیں

۱۵۔ دیوان اکسفرڈ، نمبر ۵۸۶ ۲۷، ورق ۹۵، سائز ۹ × $5\frac{1}{2}$ سطر ۱۷، خط نستعلیق، تاریخ کتابت ۲ رجب ۱۱۵۳ھ کاتب امام الدین

[illegible]

مثنویاں جن دیوانوں میں درج ہیں، ان کے اشعار کی تعداد تقریباً سب میں ایک ہے اور وہی دو مثنویاں ہیں۔ جو کلیاتِ ولی میں بھی درج ہو چکی ہیں،

انڈیا آفس کے کل دیوانوں کی جلدیں نئی بندھوائی گئی ہیں البتہ نمبر۱ میں قدیم زمانہ کی جلد بھی شامل ہے۔ میں اب ایسے کلام کو پیش کروں گا۔ جو یہاں کے دیوانوں سے دستیاب ہوا ہے اور کلیات میں موجود نہیں ہے اور چونکہ کلیاتِ ولی نہ صرف مخطوطوں سے مرتب کیا گیا ہے بلکہ مطبوعہ دیوانوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ذیل کا کلام غیر مطبوعہ ہے بالکل صحیح ہے۔

قصیدہ، مستزاد، بازگشت، مثلث، چار در چار کے متعلق مجھے کچھ صراحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس صنف کا کوئی مزید کلام دستیاب نہیں ہوا ہے۔

مخمس۔ کلیات میں کل پندرہ مخمس شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سے تیرہ تو یہاں کے دیوانوں میں بھی موجود ہیں۔ مگر دو کا یہاں پتہ نہیں چلا اس کے برخلاف ذیل کے تین مخمس کلیات میں نہیں ہیں۔ وہو ہذا:۔

مخمس

یہ برہ کی تار کیوں کی جاوی　　چلنے کی پکار کیوں کی جاوی
جان دار کی پار کیوں کی جاوی　　دل یار کو چھوڑ کیوں جاوی
زخمی سہے شکار کیوں کی جاوے

بھرتا ہوں جہاں و جگ سوں ہزار　　اس بند میں آٹھو ہوں لاچار
کیونکر ہو برہ میں مست ہوشیار　　جب لگ نہ ملی شراب دیدار
انکھیا نکا خمار کیوں کی جاوی

جب عشق کی فوج نے آئی گھیرا　　حیران ہوا ہوا اسن میرا
اس دن سوں ہوا ہوں تیرا چیرا　　یکساں ہے ہمیشہ حسن تیرا
جنت سوں بہار کیوں کی جاوی

یہ دل تری دیکھنے کو روی　　ہر شام صبح میں تل نہ سوی
یہ عمر عزیز غم میں کھودی　　انکھواں نکے اگر مدد نہ ہودی
مجھ دل کا غبار کیوں کی جاوی

عاشق کی یہی سے جگ میں تاباں　　معشوق کی تا توبہ بیر بکاناں
نہیں کام ہر ایک کا اس میں آناں　　ممکن نہیں ابدلی کا آناں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جامی نظامی مت کہو اب شعر خاقانی ہوا
حب الوطن کی مصر سوں اب یوسف ثانی ہوا

ترا غم مجھ دل منی اب ہمدم جانی ہوا

معشوق کی منزل منی آواز آیا جرس کا
کرتا جفا جور و ستم دیکھو حیا بی ترس کا

دنیا منی ثابت ہوا کچھ خوف ناہیں عرش کا
در در پکاری ہو پھروں مشتاق تیری درس کا

جل بل برہ کی آگ میں لعل بدخشانی ہوا

اس ملک ہندوستان منی مشہور کامل کا شرف
صابن لگا دھویا کرو منہ تا نہیں غم کا حرف

ہر یک سوں جارا رتا پری کم ذات کا جو ہے ظرف
راکھی فقیروں کا کمل شاہان کی مسند پر شرف

ہمنا کو جس کا بوریا تخت سلیمانی ہوا

ناصح منع کرتا مجھے ہیں مست اپنی حال سوں
دیکھی عجب ہم نے صفت معشوق کے خط خال سوں

اب چھوٹنا مشکل ہوا اس بند کی جنجال سوں
سن یہ غزل کلمہ پڑا آکاس اور پاتال ہوں

دنیا کی چاروں رکن میں دور مسلمانی ہوا
یہ دل کبوتر ہو مرا گیرا پرا شاہین کا
جل بل انگارا ہو رہا یہ کام ہے نہیں دین کا
پوچھو اگر بہر خدا تک دکھ دفا مسکن ہوا
اس سیس پر قائم اجھو لک سایہ محی الدین کا
معشوق میرے کون مدو محبوب سبحانی ہوا

رباعی۔ کلیاتِ ولی میں کل (۲۹) رباعیاں شائع ہوئی ہیں۔ جو یہاں کے دیوانوں میں بھی درج ہیں۔ مگر ان کے سوا ذیل کی رباعیاں یہاں کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ جو کلیات میں نہیں ہیں :۔

نگاہ تیز و پلک تیز و غمزہ آتش تیز — کئے ہیں دل سوں مری ملک لوسہ تیز تیز
رقیب پر چلی جو چلی بس لو خاک کری نہوں — جو حشر لگ نہ رہے بکاری بریز بریز

(دیوان نمبر ۱)

دیگر

بنچ تجھ درد کی جگ میں درد مجھے — نہیں ہمدم ودجا بھی غیر دم سرد مجھے
جب کہ دیکھا ہوں تیرا رُخ پہ نظر پڑا نہیں — عشق تیری نے کیا زر کی نمن زرد مجھے

(دیوان نمبر ا ورق ۸۹-الف)

دیگر

تحصیل دل کون ہونی یو کہ کتاب بس ہے — دانائے منتخب کون یو انتخاب بس ہے
مجھ حال کا کرے گر آکر سوال دلبر — تولا جواب ہوتا اتنا جواب بس ہے

(دیوان نمبر ۲ ورق ۱۵۰-الف)

دیگر

جبکہ وہ رشکِ پری جلوہ گرِ ناز ہوا — دل کی تسخیر کون مظہرِ اعجاز ہوا
سبزۂ خط نے رخِ یار کون بخشتا ہے جلا — دیکھ یہ رنگ عجب آئینہ پرداز ہوا

(دیوان نمبر ۵ ورق ۵۸-الف)

دیگر

یوسفِ حسن آج سستا ہے — جا کہ لینی کو جیو ترستا ہے
مدعی کون کہو کہ جیو دلوں کا — وہ نہ دیون کا جو جیو میں بستا ہے

(دیوان نمبر ۲ ورق ۵۹-الف)

دیگر

آہ سوں مجھ جگر میں چھید ہوئی   فاش مجھ عاشق کی تہمید ہوئی

اس سیہ دلسوں جا کہو یاراں   ردی دیدی مری سفید ہوئی

(دیوان نمبر ۲ ورق ۱۵۹-الف و دیوان نمبر ۵)

دیگر

تجھ یاد سوں سینہ ہے مرا روشن باغ   جس باغ کے دیکھے سوں ہوا لالہ داغ

روشن باغ میں تنگ غم کا محل باندھا ہوں   میں آہ کے حسن زیج کیے لالہ چراغ

(دیوان نمبر ۸ ورق ۹)

دیگر

شاخ گل ہے یا نہالِ راز ہے   سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے

درد آہِ شوق مشتاقاں نہیں   خط نہیں یہ حسن کا آغاز ہے

(دیوان نمبر ۵ ورق ۹۲)

دیگر

مہربانی و لطفِ دلربا   سابقا تھا سو اب نہیں دستا

یا مگر خواب وہ زمانا تھا   کہ مجھے خواب میں نہیں دستا

[illegible]

[illegible]

(صفحہ ۲۴۵، ۲۸۰)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کیفیت پیدا [illegible] ہے ۔

تو اگر [illegible] سے [illegible]   [illegible]

[illegible] ہے ۔

تو [illegible] سے [illegible]   [illegible]

[illegible]

اسی تفصیل میں غزلوں کے متعلق جو بعض حواشی کلیات ولی مطبوعہ انجمن
ترقی اردو میں درج ہیں ان کے متعلق بھی یہاں کے مواد سے روشنی ڈالنی
غیر مناسب نہیں ہے۔

غزل نمبر ۲ کلیات = کسی دیوان میں زیر بحث شعر نہیں ہے

غزل نمبر ۹ د کلیات = غزل موجود ہے۔ مگر زیر بحث شعر نہیں ہے۔

غزل نمبر ۴۳ 〃 〃 زیر بحث شعر نہیں ہے۔

غزل نمبر ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲ = یہاں کسی نسخہ میں نہیں ہیں۔

غزل نمبر ۱۶۶ = کسی دیوان میں زیر بحث غزل نہیں ہے۔

غزل نمبر ۱۶۰ = کسی دیوان میں نہیں ہے

غزل نمبر ۱۹۲ = 〃 〃 〃

صفحہ نمبر ۱۹۰ پر ایک غزل کے پانچ شعر درج ہیں، یہ غزل بھی دستیاب
نہیں ہوئی ہے +

ولی کی مثنویاں اور دہ مجلس۔ جامع کلیات ولی نے دو مثنویوں
کو درج کر کے لکھا ہے۔

ایک مثنوی غالباً ولی کی وہ مجلس کا ابتدائی حصہ ہے اور اس کے بعد

دہ مجلس کا قطعۂ تاریخ بھی درج کیا گیا ہے، مگر یہ صراحت نہیں ہے۔ کہ وہ قطعہ کس کس دیوان میں موجود ہے۔

مجھے "دہ مجلس" کے ولی کی تصنیف ہونے سے اختلاف ہے، میری رائے ہے۔ کہ ولی اورنگ آبادی نے "دہ مجلس" نام تصنیف نہیں کی، میں اپنی تائید میں حسب ذیل امور پیش کرتا ہوں۔

(ا) ولی کے اب تک جس قدر دیوان دیکھے گئے اور جن میں مثنویاں درج ہیں، اگر ایک مثنوی اس کے "دہ مجلس" کا ابتدائی حصہ ہے۔ تو اس کا صرف اسی قدر حصہ ہر دیوان میں درج ہونا ایک تعجب انگیز امر ہے، یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ کل دیوان ایک سے نقل ہوئے ہیں، اور یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ہر جامع دیوان نے کیوں دہ مجلس کے ابتدائی حصہ کو اپنے دیوان میں نقل کیا، مثنوی کا صرف اسی قدر حصہ دیوان میں ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ ولی نے اسی قدر حصہ کہا تھا۔

(ب) "دہ مجلس" کوئی تصنیف کسی ولی کی اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ نہ تو ہندوستان کے کتب خانوں میں اور نہ یورپ میں اس کا پتہ چلا، اس سے قیاس ہو سکتا ہے۔ کہ ولی کی دہ مجلس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(ط۰م)

[illegible]

(ط۰م)

[illegible]

(ط۰م)

[illegible]

[illegible]

تذکروں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے، کیونکہ شاعر کے اہل وطن کے قول کو
ترجیح ہے۔ خصوصاً جب کہ ان تذکرہ نویسوں کا زمانہ ولی سے قریب تر
بھی ہے۔ مگر دکن کے قدیم تذکروں یعنی گلشن گفتار[1]، چمنستان شعرا[2]۔ اور
ریاض حسینی[3] میں بھی کسی قدر اختلاف ہے۔ حمید نے شاعر کا نام ولی محمد لکھا
ہے۔ شفیق اور فتوت نے محمد ولی۔ بخلاف اس کے جو دیوان[4] ابوالمعالی
کے بیٹے محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں "ولی محمد" نام لکھا گیا ہے
ابوالمعالی، ولی کے خاص دوست اور رفیق تھے۔ اس لئے اُن کے بیٹے کا
ولی کے نام کو غلط لکھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ یہی نام حمید نے بھی بتایا ہے
اور حمید کا تذکرہ دکن کا سب سے پہلا تذکرہ ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر کر کے
یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے شاعر کا نام ولی محمد تھا۔

ولی کے وطن کے متعلق جو اختلاف ہے۔ اس پر جامع "کلیات ولی" مولانا
احسن مارہروی نے تفصیل سے بحث کی ہے اور بخوبی ثابت کیا ہے، کہ ولی

---

[1] مصنفہ خواجہ خان حمید (سنہ ۱۱۶۵ھ میں تصنیف ہوا) حیدرآباد سے شائع ہوا
[2] مصنفہ لچھمی نرائن شفیق (سنہ ۱۱۷۵ھ میں تصنیف ہوا) انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔
[3] مصنفہ خواجہ عنایت اللہ فتوت (سنہ ۱۱۷۵ھ میں تصنیف ہوا) ہنوز شائع نہیں ہوا
[4] یہ دیوان انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دیکھو "یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۲۸۴

گجرات کا باشندہ نہیں تھا۔ بلکہ دکن ہی اس کا اصلی وطن تھا۔ احسن صاحب نے خود ولی ہی کے دو شعر نقل کئے ہیں جن کے بعد ولی کے دکھنی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شفیق اور فتوت اور محمد تقی ولی کے اورنگ آبادی ہونے پر متفق ہیں اور دکن میں سوا اورنگ آباد کے کسی شہر کو ولی کا وطن ہونے کا دعویٰ بھی نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ولی اورنگ آباد (دکن) کے اصلی باشندے تھے۔

تاریخ وفات کے متعلق مختلف بیانات ہیں بعض اصحاب ۱۱۵۵ھ قرار دیتے ہیں اور بعض ۱۱۴۳ھ قدیم دکھنی تذکروں میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے۔ مولف "اردوئے قدیم" نے ۱۱۴۳ھ قرار دیا ہے مگر حال ہی میں مولوی عبد الحق صاحب کی تحقیق نے ۱۱۱۹ھ ثابت کیا ہے۔

ولی کی تصنیفات کے متعلق میں نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں تفصیل سے بحث کی ہے (ص ۶۴ م) یہاں صرف اسی قدر کہ دینے کی ضرورت ہے۔ کہ دیوان کے سوا اس کی کوئی اور تصنیف صحیح طور پر اس کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتی۔ دکھنی شعرا کے حسب عادت کوئی طویل مثنوی ولی نے نہیں لکھی۔ ولی کا کلام اب تک کئی بار شائع ہوا ہے اور سب سے آخر "انجمن ترقی

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہر جھاڑ پر تجھ عشق سیں پریاں ہیں قمریاں مست ہو
اپنی گلی میں بہا کر بڑھا کے ہاراں ہر طرف

ٹک تجھ حسن کوں دیکھ کر سب ہوش اپنا کھوے کر
پڑتے ہیں تیرے منقبت سب گلعذاراں ہر طرف

پڑنے ولی کے نین سوں انجھواں ایسی شدت ستے
برسے ہے جیوں بادل ستے کر کے سو باراں ہر طرف

دوست مت رکھ رقیب بدگو کوں — سُرخ روئے نہ دے سیہ رو کوں
کار عاشق تو راست بازی ہے — کج نکو کر سجن تو اپنے ابرو کوں
گیسوئے تابدار دلبر کے — دام ہیں میرے دل کے آہو کوں
دل عشاں بند ہوتے ہیں — جب وہ کھولے آپس کے گیسو کوں
خون عاشق سوں شوخ چشم ولی! — آب دیتا ہے تیغ ابرو کوں

ہوا ہے رشک مہر و مشتری کوں — سجن کی دیکھ دستار زری کوں
نہیں ہے مشک کوں کچھ قدر جب سوں — معطر کی ہے زلف عنبری کوں
ہوویں مجنوں صفت ہر نقش دیوار — اگر دیکھیں وہ اس رشک پری کوں

فراموش فلاطون حکمت کرے — اگر ملکہ کوں دیکھے ترے بوعلی
پڑے گر تیری پیچ میں زلف کے — ولایت بسر جائے اپنی ولی

زلس نرم ہیں پانو کے اُس تلے — کہ ریشم پہ رکھتے ہیں اپنی ہو چلے
گرانے مستے بوے کی غش کرے — وہ جب عطر جامے پہ اپنے ملے
ادب سیں اُسے سرو سجدہ کریں — کہ جب وہ مٹکتے چمن میں چلے
نظر کرم سوں ایک شوخ کی — چمن میں گلاں کئی ہزاراں گلے
وہ مکھ دیکھ روشن سورج آب سوں — اپس تن کتیں جال کرتے چلے
حرکت کو اس کان میں دُر کی دیکھ — دل عاشق کے مانند پارا ہلے
کرے مشتری رشک جب اس ہاتھ پر — کٹاری جو اس شوخ کے جھل جھلے
دلی کے بچن دل کے دریا ستی — نکلتے کر جیسے داراں ہر...

کدھی میری طرف لالن تم آتے نہیں سو کیا معنی
چھبیلا تک اپس کا مکھ دکھاتے نہیں سو کیا معنی

جدائی کے . . . . ہو ظالم تو میری تو جہ کوں
کہ مجھ اس دکھ کی چانسی سوں چھڑاتے نہیں سو کیا معنی
کیا ہوں جان و من اپنا فدا تیری محبت میں
اجھوں لگ بات دل مجھ سناتے نہیں سو کیا معنی
ولی اس بات کی (؟) ہے رات دن افسوس مجھ دل میں
کہ میری بات تم خاطر میں لیاتے نہیں سو کیا معنی

تیرے ہوٹاں کی لالی سوں معالی! چھپی پانوؤں میں جا منہدی کی لالی
ترا قد دیکھ تجھ پانوؤں پر جھک جھک پڑے شمشاد کی ڈالی پہ ڈالی
بیان تجھ زلف کی سیاہی کا کیا کہوں کہ نہیں ہے مثل اس کی رات کالی

یہ غزل نامکمل ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کا ایک ورق نہیں ہے۔ اس دیوان میں ایک مستزاد ایسا ہے۔ جو "کلیات ولی" (ص ۱۷۴) میں بطور سادہ غزل کے درج ہے:۔

میں سورۂ اخلاص ترے رو سوں لکھا ہوں اے معنی الفت
بسم اللہ دیوان تجھ ابرو سوں لکھا ہوں عنوان محبت

تجھ چشم کی تعریف کوں آہو کے نین پر — از وقت بنیش

اکثر قلم نرگس جادو سوں لکھا ہوں — تصویر نزاکت

اے موے میاں! وصف ترے موے میاں کی — با حال پریشانی

وحشی.... کمر پر[1] قلم مو سوں لکھا ہوں — دائم کلفت

تجھ طرۂ طرار کی تعریف کوں اے شوخ — ایسا رحیا سوں

سنبل کے چمن میں گل شب بو سوں لکھا ہوں — ہنگامۂ وحشت سوں

اے مردمک چشم اوپر[2] حال کا دلی کا — کر اپنے کرم سوں

پیکاں کے قلم کر آیس انجھوں[3] سوں لکھا ہوں — انکھیاں کی حکایت

(ہندوستانی ماہ جنوری ۱۹۳۳ء)

۱۔ کلیات۔ "چیتے کی کمر"

۲۔ کلیات: اس مردمک چشم طرف

۳۔ کلیات: "آنسو.... پلکاں"

وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے

وجہی کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں رہی۔ اس کی تصانیف میں سب سے پہلے "سب رس" کا پتہ چلا جس پر رسالہ اردو میں مولوی عبدالحق صاحب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد یورپ کے ذخیرہ سے مثنوی "قطب مشتری" دستیاب ہوئی۔ اس کے نام اور مصنف کے متعلق بلوم ہارٹ مصنف کیٹلاگ نے کوئی صراحت نہیں کی تھی۔ اس کے متعلق میں نے رسالہ معارف میں صراحت کی ہے۔ میرے دوست ڈاکٹر مولوی سید محی الدین صاحب قادری نے تفصیل سے اس پر مضمون لکھا ہے جو مکتبہ میں شائع ہوا ہے۔

وجہی کا نام اس کا سنہ پیدائش اور وفات سب تاریکی میں ہیں ہم کو نہیں معلوم اس کا کیا نام تھا؟ وہ کب پیدا ہوا؟ اور کب فوت ہوا؟ مگر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں موجود تھا اور شاعر کی حیثیت سے نامور ہو چکا تھا۔ محمد قلی (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد میں اپنی مثنوی قطب مشتری کی ۱۰۱۸ھ میں تکمیل کی۔ اس میں اس نے

نہیں ہو سکتا جس طرح سادہ الفاظ میں وجہی نے غم حسین کو بیان کیا ہے وہ تعریف کا محتاج نہیں ہے۔

وجہی کی شاعری کا نمونہ قطب مشتری اور نثر نویسی کا کمال سب رس سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس مرثیوں کا کوئی کافی ذخیرہ نہیں ہے جس سے وجہی کی مرثیہ گوئی پر اظہار خیال کیا جا سکے۔ مگر یہ بلا خوف کہا جا سکتا ہے۔ وہ مرثیہ بھی کہا کرتا اور اچھے مرثیے لکھ سکتا تھا۔

(مکتبہ حیدر آباد ماہ ۱۳۴۰ھ ف)

چند دکنی مرثیہ گو

مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی یا شمالی ہند سے ؟ مگر بقول نعیم حسین خاں خیالؔ شمالی ہند میں ہمایوں کے دوبارہ واپس ہند آنے کے پیشتر مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا۔ مگر اس کے کم و بیش نصف صدی پہلے دکن میں ان کا رواج تھا۔ ابتداً تو محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے۔ مگر اس کے بعد بہت جلد دکنی مرثیوں کا آغاز ہو گیا

دکنی مرثیوں کا ایک مجموعہ اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیکھا گیا ہے۔ ایک اور بیاض کنگ کالج کیمبرج میں ہے۔ ہمارے خاندانی کتب خانوں میں متعدد بیاضیں ہیں۔ جن میں سے ایک ہمارے پیش نظر ہے۔

ان بیاضوں میں مرثیے۔ نوحے۔ سلام سب کچھ موجود ہیں۔ ان کے مرثیوں کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

۱۔ بیاض مملوکہ اڈنبرا یونیورسٹی دیوان حسینی سے موسوم ہے۔ اس میں ہاشم علی برہان پوری کے تقریباً (۲۵۰) مرثیے۔ نوحے اور سلام کے علاوہ قادر کا ایک نامکمل مرثیہ ہے۔

۲۔ بیاض اڈنبرا یونیورسٹی گویا اول الذکر کا تکملہ ہے۔ کیونکہ قادر کا مرثیہ اس میں مکمل ہوا ہے۔ اس میں (۸۰) شعرا کے ۳۰۰ مرثیے۔ نوحے وغیرہ ہیں ان دونوں بیاضوں کے اوراق کی تعداد (۴۲۷) ہے۔ ان کے متعلق مصنف کیٹلاگ کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

"مراثی حضرت علیؓ۔ آنحضرتؐ اور حسینؓ مصنفہ ہاشم علی جو اردو کا ایک ابتدائی شاعر تھا۔ یہ ہاشم ولی اور قاسم کے پہلے گذرا ہے۔ یہ جہانگیر کے زمانہ میں بیجاپور میں رہتا تھا۔ سنہ ۱۰۳۰ھ اور سنہ ۱۰۶۵ھ میں بھی زندہ تھا۔ ایک

اور ۱۰۴۶ھ جو صفحہ (۵۳) پر درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ تصنیف اسی
سنہ میں ہوئی ہے۔ ہاشم شیخ احمد فاروقی کا مرید تھا جن کا انتقال ۱۰۳۴ھ میں ہوا ہے
ہاشم علی چند دیگر کتابوں کا بھی مصنف ہے۔ ایک فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔
چند اشعار کاظم اور قادر کے بھی ان جلدوں میں شامل ہیں۔" مصنف کی یہ صراحت صحیح نہیں
ہے۔ اس کا زمانہ گیارہویں صدی نہیں۔ بلکہ بارہویں صدی ہجری ہے۔ آگے
چل کر اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

۳۔ بیاض کنگ کالج اس میں (۳۲) شعرا کے تقریباً (۵۰) مرثیے ہیں دیباچہ کے
ایک ورق پر تاریخ کتابت حسب ذیل درج ہے:۔

"تمت تمام شد بدست فقیر العباد غلام نبی ۲۶ ربیع الثانی
۱۱۵۷ھ ہجری۔"

۴۔ بیاض کتب خانے مولوی صفی الدین مرحوم اس میں (۲۴) شعرا کے
(۱۱۴) مرثیے ہیں۔ تاریخ کتابت درج نہیں۔ مگر یہ مولوی صفی الدین صاحب
مرحوم کو ان کے والد کے ترکہ میں ملی ہے۔ مولوی صاحب کے والد نواب
سالار الملک کا انتقال ۱۲۸۳ھ میں ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ
اس کی کتابت ۱۲۸۳ھ سے پہلے ہوئی ہے۔

د۔ دکھنی مرثیوں میں ہندوستانی فطرت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، ہندوستانی ماحول کا اثر ان کے مرثیوں میں پایا جاتا ہے، ہندوستانی ماں، ہندوستانی بیوہ، ہندوستانی بہن، ہندوستانی دُلہن کی جھلک اُن کے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔

ک۔ ان مرثیوں میں سیرت نگاری کا حق بھی ادا کیا گیا ہے، ان میں نہ صرف بیانی سیرت نگاری ہے۔ بلکہ مکالمے کے ذریعہ بھی سیرت نگاری کی گئی ہے۔

و۔ روایات کو بھی نظم کیا گیا ہے مگر فرضی روایات اور افسانے ان کے مرثیوں کا جزوِ اعظم نہیں ہیں۔

ز۔ اکثر مرثیوں سے مصنفین کے متعلق تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں شاعر کے نام اور وطن اور ان کے ہم عصروں کی صراحت معلوم ہوتی ہے

ح۔ مبالغہ اور تصنع کو زیادہ کام میں نہیں لایا گیا ہے۔

دکھنی مرثیوں کا ذکر تین دور میں کیا جاسکتا ہے یعنی قطب شاہی و عادل شاہی مرثیہ گو۔ دورِ مغلیہ کے مرثیہ نویس اور عہدِ آصفیہ کے مرثیہ گو سردست ہم صرف دو ابتدائی دور کے مرثیہ گو کا تعارف کراتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

۴۔ علی عادل شاہ بیجاپور۔ سلاطین قطب شاہی کی طرح بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین علم دہنر ہی کے سرپرست تھے۔ علی عادل شاہ ثانی اس سلسلہ کا آٹھواں تاجدار ہے جس نے ۱۰۶۶ھ سے ۱۰۸۳ھ تک حکمرانی کی۔

اس کا دورِ حکومت ترقی علم و فن خاص کر اردو کی ترقی کے لئے مشہور ہے۔ اس کا دربار باکمالوں کا مجمع تھا۔ دور دور سے اہلِ علم و فضل آکر اس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ اس کے زمانہ میں بیجاپور علم و ہنر کی قدردانی کے لحاظ سے رشکِ بغداد اور قرطبہ بنا ہوا تھا۔ ہر ایک مورخ نے سلطان کی تعریف کی ہے اس زمانہ کے مشاہیر علما کی طویل فہرست ہے جن میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں۔ قاضی نوراللہ جنہوں نے اس کے دورِ حکومت کی بہترین تاریخ لکھی شاہ کمال الدین۔ ملا فتح اللہ شیرازی میر ابراہیم ابن ملا حسین ابوالحسن تکونہ۔ ارسطو زمان، ملا احمد، میر نعمت اللہ۔ شاہ میراں جی، مصطفیٰ خان کیانی وغیرہ۔

سلطان کو شعر و شاعری سے خاص ذوق [illegible] و شوق کا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خلقِ محمدؐ کرم مرتضےٰ سے علیؓ
انسان ہور عین یو اپنا سیر کرو
دل میں بقا کے گھر کا اگر ہے ہوش من
نیکی کے دام خرچ کرو جنت میں گھر کرو
بیدرد ہے جکوئی خوش اس تے خدا نہیں
مرد ہو گلے میں درد کے یک دم گذر کرو
ایمان جون چراغ ہے عاقبت کے دار کا
بار اگلے انہ تیوں جتن اس دل بہتر کرو
منکینے ہے چو کے سار جو سب کون عزیز اچھے
امرت کنکوں ہور زبان کون شکر کرو
بے دین ہو یزید کیا دین میں خلل
لعنت مدام اس کے اوپر سر بسر کرو
گر شہ علی ہے بات میں ثابت قدم تمیں
آیات ہور حدیث ہور سب میں اثر کرو
جو کوئی تمنکون جیو دی پیدا کیا اول
دکر چلو نیت نہ آپس کون نذر کرو

[illegible]

[illegible] (8)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کسی نے موزون نہیں کی۔ مگر یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے۔ اس قسم کی نظم کا خاص نام اس وقت تھا یا نہیں؟ میرا خیال ہے۔ چونکہ اس قسم کی یہ ابتدائی کوشش تھی۔ اس لئے اس کا کوئی خاص نام نہیں تھا۔ زمانۂ مابعد میں اس کو ریختی سے موسوم کیا گیا ہے۔

مصنف بساتین السلاطین نے تعریف کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"و نیز از جملہ ہندی گویان ان زمانہ میاں ہاشمی است۔ کہ بفیض لعاب دہن مبارک حضرت پیر دستگیر شاہ ہاشم قدس سرہ زبان شیریں بیان کشادہ در میان سخنوران گوی سبقت بردہ۔ ترجمہ یوسف زلیخا را بمحاورۂ آن وقت نظم آوردہ و دیوان غزل مشتمل بر مضامین سنجیدہ و تلازمات شعریہ ہم داد کہ مقبول طباع افتاد و در اشعار طرازی نادر روش غریب در زبدہ است کہ ہیچ کس بر آوردن سیاقت نزادہ۔ باوجودے کہ بعبیر مادر زاد بود:

(صفحہ ۹۲ ب انڈیا آفس)

غرض کہ ہاشمی کی قابلیت مسلمہ تھی۔ دیگر شعرا کی طرح وہ حسب رواج مرثیہ

بھی کہا کرتا۔ مگر افسوس اب سب ناپید ہیں۔ ہم کو اس کا ایک مرثیہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ افسوس ہم نے پورا نقل نہیں کیا جو کچھ نوٹ کیا گیا یہاں پیش کیا جاتا ہے :۔

دلبند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں؛
فرزند مرتضےٰ کا تابوت لے چلے ہیں

سلطان دو جہاں کا سردار اولیاء کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

حضرت حسین حسن کا شاہ زمین زمن کا
حضرت بنیٔ سنگا تابوت لے چلے ہیں

حضرت کے تھے نواسے حیدر کے تھے خلاصے
ہوئے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں

اے ہاشمی شہاں کا سلطان دو جہاں کا
مقبول اوس جوان کا تابوت لے چلے ہیں

(از بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی)

یہ مرثیہ زبان کی صفائی کے لحاظ سے ممکن ہے ہاشمی بیجاپوری کا شمار

جدکا دل ہیں لیے چلے ارمان جینا　　پائے نہیں اس درد کا درماں جینا

ایک اور مرثیہ کے چند شعر

پیئے نہیں ابن حیدر آج پانی　　پور کاریں دین کے رہبر آج پانی
کہاں روئے زمین پر آج پانی　　مگر در حوض کوثر آج پانی
دہن سو کا کہاں ہے کاظم غم سوں میرا　　نہیں یہاں آسرا میرا تیرا
قلم کرتا نہیں کاغذ پہ پھیرا　　سہا ہی کون نہ رہبر آج پانی

مندرجہ بالا انتخابات سے کاظم کے مرثیہ کا اندازہ واضح ہو سکتا ہے

(۲) شاہی۔ شاہ قلی خاں گولکنڈہ کا مرثیہ گو تانا شاہ کے ندیموں سے تھا پہلے تو فوج سے تعلق تھا۔ مگر علمی قابلیت کے باعث بہت جلد شاہی کو شاہی تقرب حاصل ہو گیا۔ مذہب کے لحاظ سے اس کو بڑا سخت تعصب تھا۔ اپنے مرثیوں میں صحابہ کی شان میں بڑی گستاخی کی ہے۔

مرثیہ گوئی میں اس کو خاصی مہارت تھی اور اس کے مرثیئے عام طور پر مشہور اور مقبول تھے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے ان کو زبانی یاد کر لیا تھا۔ ان کے ذریعہ وہ شمالی ہند میں بھی پھیل گئے جہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بھی پڑھے جاتے تھے۔

اس کے دو مرثیے اڈنبرہ والی بیاض میں اور ایک مختصر مرثیہ مولوی صفی الدین مرحوم والی بیاض میں موجود ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کے مرثیے نہایت بلند پایہ ہیں۔ واقعہ نگاری کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ ادبی حیثیت کے سوا زبان کے لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ درجہ کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

ہائے غریب یتیم نمانے عابد تیری زاری ہے،
باپ کا مرنا دکھ کا بھر نا تس پر یوں بیماری ہے
تیغ کھڑی لے دشمن سر پر دا ویلا دکھ بیماری ہے
درد مصیبت عابد تم پر آج کے دن لبیاری ہے
جبرئیل کہیں بتلاؤ مجھ کو نام ہے کیا اس ادی کا
سنا جب کربل یہی ہے تقل حسین علی سے ہادی کا
کہا بہشت سے پیام لیا یا عابد تیری وادی کا
کٹھن گھڑی ہو پڑتے میرے تجھ پر کیا سنگ ساری ہے

(۳) مرزا قطب شاہی۔ مرزا ابوالقاسم نام۔ مرزا تخلص تانا شاہ کا مصاحب تھا اس کے گرفتار ہونے پر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مرثیہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتا تھا

قدیم تذکرہ نویسوں نے مرزا کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعض شعر نقل کئے ہیں۔ مگر کسی نے اس کے مرثیہ گو ہونے کی صراحت نہیں کی۔ ہماری تحقیقات کے لحاظ سے یہ مرثیہ گو تھا۔ کثرت کے ساتھ مرثیے کہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے بڑی عمر پائی۔ کیونکہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

مرزا نے مختلف عنوان کے تحت مرثیے کہے ہیں اور اکثر طویل ہیں مثلاً قصہ امام حسین کے عنوان سے ایک مرثیہ ہے۔ جس کے (۱۰۸) شعر ہیں۔ قصہ امام قاسم کے مرثیہ کے (۲۱۶) شعر۔ قصہ حر شہید کے (۱۶۷) شعر مرثیہ حضرت امام کے (۲۷) شعر ہیں۔

ان مرثیوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کیا بلحاظ واقعہ نگاری اور کیا بلحاظ اسلوب بیان اور طرز ادا اور کیا بلحاظ لطف زبان مرزا اپنے وقت کا کامل الفن مرثیہ گو تھا۔ اگرچہ زبان کی صفائی کے لحاظ سے وہ سلیس نہیں ہیں لیکن کلام میں بلا کا اثر ہے۔

ذیل میں مرزا کے مرثیوں سے کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے ہمارے دعوے کی تائید ہو سکتی ہے:۔

(۴) مرزا (بیجاپوری) علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا نامور مرثیہ گو تھا۔ جس نے سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ کا اس قدر شوق تھا۔ کہ انتقال کے وقت بھی ایک مرثیہ کا عنوان ہی لکھ رہا تھا۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ مگر کبھی کوئی قصیدہ لکھا اور نہ مدح گوئی کی۔ بادشاہ نے خود اس سے خواہش کی۔ مگر اس نے مدح کے بجائے ایک مرثیہ میں بجائے اپنے تخلص کے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔

مرزا اپنی مرثیہ گوئی کو ایک مذہبی فرض تصور کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے مرزا اپنا مرثیہ سنا رہا تھا۔ ذیل کے شعر کے

دلاں پا کھاں اناراں کر کھو سینہ طبق میانے

مصرعہ ثانی کے لئے مضمون نہ مل رہا تھا۔ اس پر مدہوشی طاری ہوئی۔ دیکھا کہ آنحضرت صلعم تشریف فرما ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ

نبی کے محشر کون یوں تحفہ کر لے جانا ہے

. . . .

(ص ۹۲ بساطین السلاطین۔ برٹش میوزیم)

اس کی شہادت یوم عاشورہ ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا۔ کسی ظالم نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔ افسوس ہے۔ سنہ وفات معلوم نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ۱۱۸۳ھ کے قبل اس نے شہادت پائی۔

مصنف بساطین السلاطین نے مرزا کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے:۔

"یکے از شعرائے مقبولین آں زماں مرزا مرثیہ خوانست کہ زبانِ خود وقفِ حمد و نعت حضرت سید المرسلین و منقبت آئمہ طاہرین نمود۔ ہرگز بد احدے از شاہ و گدا شعر نہ گفت۔ مرثیہ ہائے بے شمار کہ در ماتم شہدائے کربلا گفت زبان زد خاص مردم دکن و دیگر بلاد گردید۔" (صفحہ ۹۲)

چونکہ ہم کو مرزا کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے کلام کے متعلق کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ مگر یہ ظاہر ہے۔ جس شخص کی تمام عمر ہی مرثیہ گوئی میں بسر ہوئی ہو۔ تو اس کا کلام کس پایہ کا ہوگا

ذیل میں ایک مرثیہ کے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔ جو بعض اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے بیجاپور کے مرزا کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

شریعت اساسی پہ ایتا ستم — حقیقت شناسی پہ ایتا ستم
نبیؐ کے نواسے پہ ایتا ستم — سب اُمت کے آسے پہ ایتا ستم
دیا زہر پانی میں با ظالماں — سولا گا کلیجے کون جا کر تڑاں
جگر ٹوٹہ حسنؓ کا پڑا بے گناہ — مدینہ کے باسی پہ ایتا ستم
حسینؓ ابن حیدر خدا کا ولی — جگر گوشۂ فاطمہؓ اور علیؓ
بروج دہ دوہ کا بدر جلی، — نہ کر گھر اسی پہ ایتا ستم

مبارک بدن سوں ہوا سر جُدا
اسی غم سوں کہتا ہے مرزا سدا
کیا کیا وہ بدبخت نے اے خدا
شہنشہ پیاسے پہ ایتا ستم

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے یہ چند مرثیہ گو ہیں۔ امید ہے کہ اس صراحت سے ان کے کلام کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے گا۔

دورِ مغلیہ

ہم قطب شاہی اور عادل شاہی مرثیہ گویوں کا تعارف کرا چکے ہیں۔ اب دورِ مغلیہ کے چند مرثیہ گو پیش کئے جاتے ہیں۔

دکن کی اسلامی سلطنت (بہمنیہ) محمد تغلق کے عہد میں قائم ہوئی اور دہلی کا تعلق منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً تین سو سال تک شمالی ہند سے جنوبی ہند کا تعلق نہیں رہا۔ مگر اکبر اعظم وہ پہلا شخص ہے جس نے ۹۹۵ھ میں پھر سے دکن کی فتح کا ارادہ کر کے حملہ کیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے بعد عالمگیر نے دکن کی فتح کا ارادہ مستحکم کر لیا۔ ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ فتح ہو کر سلطنت دہلی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح اب پورا جنوبی ہند مغلیہ سلطنت کا جزو ہوگیا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعرائے اردو کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اُن کے ساتھ بے حد مراعات کی جاتیں۔ انہیں ان کی تصنیفات کا معقول صلہ دیا جاتا تھا۔ نہ صرف سلاطین بلکہ امرا، دکن بھی اردو کی سرپرستی کرتے تھے، ان قدر دانیوں کے باعث عام طور پر شعر و شاعری کا رواج ہو گیا تھا

[illegible]

اے شمعِ بزمِ مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے تم بن جہاں جلوا دکھاتے کیوں نہیں

وہ جاہلِ دوزخ وطن آئے ہیں بادل کے نمن
جو برقِ تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں

وہ شمعِ بزمِ مصطفیٰ بادِ اجل سوں گل ہوا
سب سوزِ دل سوں تن ہوا سدا یاراں گلاتے کیوں نہیں

چھوڑو سکل دنیا کے کام دس رین تلک اے خاص عام
ماتم کے آتش میں مدام تن کون جلاتے کیوں نہیں

سنتے ہو تم اے مومناں شہ کی شہادت کا بیاں
سب خاک و خوں کے درمیاں تن کو ملاتے کیوں نہیں

سلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

شمس الضحیٰ پر سلام بولو	بدر الدجا پر سلام بولو
شیرِ خدا پر سلام بولو	آلِ عبا پر سلام بولو
ذوقی کہتا ہے صبح و مسا میں	اس رہنما پر سلام بولو

(از بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی)

(۲) احمدؔ۔ اس تخلص کے بھی دکن میں متعدد شعرا ہوئے ہیں۔ جو اپنے قوت بیان کے باعث شہرت رکھتے تھے قطب شاہی دور میں ایک احمد تھا۔ جو وجہی کا معاصر ہے مگر غالباً اس نے مرثیے نہیں کہے مغلیہ دور کا یہ دوسرا احمدؔ دکنی ہے جس کے مرثیے مشہور ہیں۔

شمالی ہند کے تذکرہ نویسوں نے احمد کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کی۔ میر حسن اور قائم احمد کو گجراتی بیان کرتے ہیں۔ عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا میں اس کو غلام احمد علی کے نام کے ساتھ برہان پوری لکھتے ہیں۔ اسپرنگر نے بھی اسی احمد کا ذکر کیا ہے ممکن ہے ان دونوں احمدوں کا وجود بھی ہو۔ مگر ہم جس احمد کے مرثیے پیش کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں سے جدا ہے۔ اس کا نام مقیم احمد تھا اور یہی تخلص کرتا تھا برہان پور کا باشندہ ہے غالباً یہاں ہی فوت ہوا ہے۔

اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے سات مرثیے ہیں۔ جن کے (۱۶۰) اشعار ہیں مولوی صفی الدین والی بیاض میں اس کے تین مرثیے ہیں جن کے (۴۵) شعر ہیں۔ اڈنبرہ کے سات مرثیوں کے جملہ دو مرثیے تو امام حسینؑ کی مدح میں قصیدے ہیں۔ دو مرثیوں میں آپ کے خاندان کی تباہی اور بے سروسامانی حیرانی و پریشانی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایک

مرثیہ دونوں بیاضوں میں مشترک ہے۔ اس طرح ہم کو تمیم احمد کے نو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن کے (۲۰۵) شعر ہیں۔ نمونہ کلام:۔

مرثیہ حضرت امام حسینؑ

حیف گھایل حسین تن تیرا　　جسم پر خون ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کیدھر تن تیرا　　کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا

نہیں ملیا بوند کس کینتن پانی
سخت طفلاں کی سر پو حیرانی
حیف اصغر نے تجھ کوں روانی
جگسوں پیاسا گیا تن تیرا

تیر لگ مکہ سوں لہو جو اچھی تھی　　دا مصیبت میں بال پن تیرا
اے توں دلبر حسینؑ کے اصغرؓ　　آج روتا نہیں توں (؟) ابٹ کر

تیر لگ حلق سب لہو سوں بھر
کیوں چوچی سے رہا وھن تیرا

۳۔ **اشرف**۔ سید اشرف اسی زمانے کا باکمال شاعر تھا۔ اس کی مثنوی اور مرثیے قابلیت کی یادگار ہیں

ان اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اشرف کا کلام کس قدر صاف ہے۔ اس کے مرثیوں میں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے :-

(۲۷) امامی - یہ بھی اسی زمانے کا مرثیہ گو ہے، اس کے متعلق تذکرہ فتوت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ برھان پور اس کا وطن تھا اور مہرکنی اس کا پیشہ، مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ اور اس کا اعتقاد تھا۔ کہ وہ حضرت امام حسین اور آپ کے خاندان کا مداح اور پیرو ہے، اس طفیل اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے اٹھ مرثیے ہیں، ان کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے۔ کہ امامی کا اسلوب بیان دلکش ہے، اس کے مرثئے ڈرامائی اثر رکھتے ہیں اور پھر ان کی زبان بھی بہت صاف ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے۔ کہ وہ بہت بعد کے لکھے ہوئے ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو :-

کیا ظالماں نے ظلم کیا بے حساب آج   مظلوم کربلا میں ہیں عالی جناب آج
اس غم سوں مومناں کوں ہوا پیچ و تاب آج   گویا علی کے گھر کا کھولا غم کا باب آج

تھا آئینہ رسول کو درشن حسین کا
ہے وہ جفا کی گرد میں درپن حسین کا

زخماں کے جوہراں میں سے تن حسین کا
دستا ہے جوں شفق میں نول آفتاب آج

کیوں عرش فرش پر نہ گرا بے قرار ہو
کیوں تاب لا سکے نہ فلک دیکھ ظلم یو
مینا سے قد کوں شہ کے شکستہ کیا دیکھو
سنگیں دلاں نے ظلم کی پی کر شراب آج

یارب بحق خواجۂ کونین مصطفےٰ ؐ
یارب بہ حق فاطمہؓ ناموس مرتضےٰ ؓ
یارب بہ حق جملہ اماماں مجتبےٰ
برلا ہر یک مراد امامی شتاب آج

ایک دوسرے مرثیے کے چند شعر :-
محشر میں جب محمد شاہ زمن اُٹھیں گے
سب انبیائے مرسل پر غم حزن اُٹھیں گے

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

معلوم ہوتا۔ البتہ دونوں ہمعصر ضرور ہیں ۔

رضی کے مرثیے دکن میں بڑی شہرت رکھتے تھے، اس کے مرثیوں
کی تضمین کی جاتی تھیں۔ اڈنبرو میں اس کے نو مرثیے ہیں۔ جن کے
(۸۷) شعر ہیں۔ اس کے مرثیوں کا خاص جوہر سوز و گداز اور مرثیہ پن ہے
نمونہ کلام حسب ذیل ہے :۔

نالہ و فریاد و واویلا ہے اے پروردگار
غم سیں آل نبی کا دل ہوا ہے بے قرار
ظلم دشت کربلا میں دیکھ بے حد و شمار
ادمتی محشر تلک روتے ہیں دو کہ سوں زار زار

داغ غم سوں شاہ کے ہر ہر طرف کھلا ہے باغ
لالہ خونی کفن ہے دل میں تب سوں داغ داغ
پھول بن میں جب ستے پایا ہے اس غم کا سراغ
جامہ اپنے بر منے پہنا ہے سوسن سوگوار

ماتم شہ سوں پڑی خرمن پہ دل کے بے جلی
تب سے حاصل ہوئی افسوس ہم کوں بے کلی
نین جوں بادل کیتی ہور راہ جیسے بانسلی
غم کے جنگل میں بجاتا ہوں سدا بے اختیار

اور ایک مرثیہ :۔

آل نبی کے غم سوں بے خود ہوں یوں پوکارا
دل مے رود زدستم صاحب دلاں خدا را
دل میں چھپا رکھا تھا حضرت حسین کا غم
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

بچھڑے حسین سوں جو بے اختیار بولے
باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را
پیاسے فرات کے سب کوثر پہ یوں سنے گے
ہات الصبوح حیوا یا ایہا سکارا
فریاد واہ دیلا کلثوم کے زبان کا
در رقص حالت آرد پیران پارسا را

کرتے تھے شاہ سب سوں صحرائے کربلا میں
با دوستاں مروت با دشمناں مدارا

لعنت ہے ظالماں پر جن کے طرف سوں ہر دم
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

آل نبی سوں رکھنا ہر دم منے محبت
اشہیٰ لنا واحلیٰ من قبلہ العذارا

حافظ رضی قرآن میں لعنت ہے ظالماں پر
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

غم سوں ہے بے قرار میرا دل	دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشن غم میں ہے شہیداں کے	لالۂ داغدار میرا دل
نت شہیداں کے زخم غم سین	شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل
غم کی بجلی پڑی ہے جب سنے	تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے	ہو کے غم کا شکار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضی	کیوں نہ ہو پُر غبار میرا دل

(۶) ولی - دکن کا مشہور شاعر ہے، ان کا نام ولی محمد اور وطن دکن تھا۔ انجمن ترقی اردو کے شائع شدہ کلیات کے سوا جو کلام یورپ وغیرہ میں دستیاب ہوا تھا، وہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

ولی کے دیوانوں میں کوئی مرثیہ یا سلام شامل نہیں ہے اس سے قیاس ہوتا ہے۔ غالباً ولی نے اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت کے رواج کے موافق ولی نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے تین مرثیے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ ہم نے ان کو مکمل نقل نہیں کیا۔ چند شعر نوٹ کئے گئے تھے جو پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ مرثیے غزل نما ہیں:۔

غوغا ہوا جہاں میں شہ کے وصال کا سینے منے پڑا ہے چھالا اس ہلال کا
محتاج ہیں جہاں کے محبان تمام مل دیدار چاہتے ہیں مبارک جمال کا
جو کوئی کرے زمانہ سوں ادنو کا ذرہ دام
ہے یہ ولی خلاصے جواب و سوال کا

اے ہادی نیسار تو کیوں جا بسایا کربلا اے واقف اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا
اے نور چشم مصطفےٰ فرزند نوشاہ مرتضیٰ اے دلبر خیر النسا تو کیوں جا بسایا کربلا

تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے
تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا بسایا کربلا

اوس نورِ مصطفےٰ پر بولو سلام یاراں   محبوبِ مرتضیٰ پر بولو سلام یاراں
اوس پاک پارسا پر حیدر کے دلربا پر   اوس لعلِ بے بہا پر بولو سلام یاراں
یو جی ولی فدا کر اوس شاہِ کربلا پر
اوس لائقِ ثنا پر بولو سلام یاراں

یہ ہیں چند مرثیہ گو جو دورِ مغلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہیں معلوم اور کون کون مرثیہ گو تھے جن کے حالات سے ہم ناواقف ہیں ؛

نوٹ

قدیم اردو شعرا ہم مخرج حروف کا املا سب سے زیادہ سادہ حرف سے لکھتے تھے۔ مثلاً "س" "ث" اور "ص" کی بجائے "س" "ز ذ" اور "ض ظ" کی بجائے "ز"۔ چنانچہ آتا کا املا اسی اصول کے مطابق ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ولاں پھاکاں اناراں کر رکھو سینہ طبق میانے

اس پر مدہوشی طاری ہوئی اور آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا:-

بنی آدینگے محشر کوں یو تحفہ کرے جانا ہے

مرزا کی شہادت بھی یوم عاشورہ ہوئی بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا کسی ظالم نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔ افسوس ہے سنہ انتقال معلوم نہیں۔ مگر یہ یقین کیا جا سکتا ہے۔ کہ سنہ ۱۰۸۳ھ کے قریب اس کی شہادت ہوئی:-

مؤلف بساتین السلاطین نے اس کی بڑی تعریف کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"یکے از شعرائے آں زماں مرزا مرثیہ خوان است کہ زبان خود وقف حمد رب العالمین و نعت حضرت سید المرسلین و منقبت ائمہ طاہرین و مرثیہ سید الشہدا و شہدائے کربلا نمودہ ہرگز گاہے زبان خویش در مدح اہل دنیا از شاہ و گدایان وا نمودہ۔ و مرثیہ ہائے او دراں زمان مقبول خاص و عام و مشہور بلاد دکن بودند

مرو لکنڈہ کے مرزا کے متعلق ... [illegible] ... سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ ابوالحسن تاناشاہ کا درباری شاعر تھا۔ جب عالمگیر نے
تاناشاہ کو قید کرلیا۔ تو مرزا عبداللہ گنج حیدرآباد میں فقیرانہ طور پر
زندگی بسر کرنے لگا۔ اڈنبرہ کی بیاض میں مرزا کے پندرہ مرثیے ہیں۔ ان سے
معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا مصنف ۱۱۵۰ھ تک زندہ تھا۔ بعض اصحاب کا
خیال ہے۔ کہ یہ کل مرثیے ایک شخص کے نہیں ہوسکے۔ کیونکہ ۱۰۹۸ھ کا درباری
شاعر ۱۱۵۰ھ تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے اگر (۱۰۸۳ھ) میں جبکہ
تاناشاہ تخت نشین ہوا ہے۔ اس کی عمر تیس سال قرار دی جائے تو ۱۱۵۰ھ
میں (۹۷) سال کی عمر ہوگی۔ جو صحیح تصوّر نہیں کی جاسکتی یہ ہوسکتا ہے کہ
تاناشاہ کے زمانہ میں یہ نوعمر ہو اور اس کے مابعد عرصہ تک زندہ رہا ہو۔

اڈنبرا کی بیاض کے علاوہ ہمارے بزرگ مرحوم مولوی صفی الدین صاحب
کے کتب خانہ میں ایک بیاض ہے۔ اس میں مرزا تخلص والے شاعر کے
پینتیس مرثیے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ تیقن کے ساتھ ہم ان کو بھی کسی خاص
مرزا سے موسوم نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس اس کا کوئی قطعی ثبوت
نہیں ہے۔ کہ یہ مرثیے آیا بیجاپور کے مرزا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا گولکنڈہ
کے مرزا سے۔

مگر ان مرثیوں کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی عہد کی پیداوار ہیں
اور ان کا کہنے والا اپنی تمام عمر امام کی مرثیہ خوانی میں بسر کر دیا تھا۔ بعض
اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم
کی بیاض کے مرثیے' بیجاپور کے مرزا کے ہو سکتے ہیں۔

اس کے قطع نظر یہ مرثیے گولکنڈہ والے مرزا کے ہوں یا بیجاپور والے
مرزا کے مگر اس میں کوئی شک نہیں یہ مرثیے ان ہی دو سے کسی ایک کے
ہو سکتے ہیں۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اصل مرثیوں کا نمونہ پیش کر
دیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اپنی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں صراحت
کی ہے کہ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ مرثیوں کی ابتدا
دکن سے ہوئی۔ مگر زمانہ مابعد میں شاعری کی اس صنعت نے جو ترقی
ایک فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں حاصل کی۔ وہ دکھنی مرثیوں کو حاصل
نہیں ہوئی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جو بات مرثیہ پن کی دکھنی مرثیوں کو
حاصل رہی وہ لکھنؤ کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی۔ دکھنی مرثیوں کا خاص
مقصد مجلس عزا کو رلانا تھا۔ وہ اپنے کلام میں سوز و گداز رنج و غم کے مضامین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قصہ کوں شاہ سرورکا حسین بن سر صفدر کا[1]

دونوں عالم کے رہبر کا کرو زاری مسلماناں

اس مرثیہ میں اصغر کا غم قابل ملاحظہ ہے :-

کہوں دکہ درد اصغر کا او نور چشم سرور کا

شہ غازی کے جوہر کا کرو زاری مسلماناں

عزیزاں دل ہوا پرخون یوسن اصغر کے ماتم کوں

گئے معصوم شہادت سوں کرو زاری مسلماناں

سخت معصومیت جب تھے چھٹے مہینے کی عمر سب تھی

بلا کی پیاس کی تب تھی کرو زاری مسلماناں

. . . .

انھا یک کا فرسنگ دل ہوا دوزخ اسے حاصل

دیا سردار کوں دکہ مشکل کرو زاری مسلماناں

---

[1] ہمارا یہ اصول رہا ہے کہ اشعار کو کاتب کو نقل کیا جائے۔ تاکہ ناظرین کو اصل مخطوطہ میں جس طرح مذکور ہے۔ اس کا پورا اندازہ ہو جائے۔ یہاں بھی اسی اصول کے تحت کاتب نقل کیا گیا ہے۔ اس لئے اغلاط ہیں ؛

عجب تھا ادرنگ یدخو حسین دریا پر دکھو
ان کے آ تیر ماریا او کرو زاری مسلمانان

لگیا تیرا حلق بہتر حسین سردار کے سینے پر
ہوئے معصوم شہید اصغر کرو زاری مسلمانان

دیکھے اصغر کون شہ یوں جب چلیا غم سوں دریا تب
اٹھا ڈیرے میں لائے تب کرو زاری مسلمانان

ہُوا تھا دل دکھوں پرخون بلا کاشوم زینب کون
کہے یوں شہر بانوں سوں کرو زاری مسلمانان

کہے اصغر کون لایا ہوں اُسے کوثر پلایا ہوں
سو جنت میں سولایا ہوں کرو زاری مسلمانان

اسی مرثیہ میں حضرت امام کا جنگ کے لئے تیار ہونا :-

بندی دستار تب سر کا حسین سلطان رہبر کا
زرہ پہنی سو حیدر کا کرو زاری مسلمانان

سپر حمزہ کا لیتے ہیں ان پر زینب لے دیتے ہیں
حمائل بر میں کئے ہیں کرو زاری مسلمانان

لئے صمصام ہت سرور سو شمشیر علی صفدر

ہوئے مستعد شیر د نر کرو زاری مسلمانان

جنگ کے لئے مستعد ہو کر میدان میں تشریف لاتے ہیں اور بڑی

دیر تک جنگ ہوتی ہے۔ اس کے بعد:۔

غضب سوں حیدری کئے او دل زیر و زبر کئے

زمین اس لہو سوں تر کئے کرو زاری مسلمانان

ترنگ جس صف میں پائے ہیں سو اس دل کو اچائے ہیں

دنیا کا سوں پھر لئے ہیں کرو زاری مسلمانان

. . . .

لگے ظالم تیران مارن چریاں زخمان مبارک تن

عرش کرسی لگے کاپن کرو زاری مسلمانان

نبی کے نور دیدے پر لگیا تیر آ پیشانی پر

چریا ابو مکہ نورانے پر کرو زاری مسلمانان

جسے یو درد مطلق ہے اسے جنت سو برحق ہے
او سب زینت کے لائق ہے کرو زاری مسلمانان
جکوئی اس غم سوں نت روئے گنہ سب سوں دہوئے
سو روبشیک دلی ہوئے کرو زاری مسلمانان
کہیا مرزا یو درد و غم نبی کے آل پر ہردم
و صلوات سب عالم کرو زاری مسلمانان

دوسرا مرثیہ قصۂ امام قاسم کے عنوان سے ہے۔ یہ بڑا طویل مرثیہ ہے۔ اس کے (۲۱۶) شعر ہیں۔ ذیل کے شعر سے ابتدا کرتا ہے :۔

کہوں قصۂ شجاعت کا سو قاسم کی شہادت کا
یزیدان کی عداوت کا کہو یاراں صد احد حیف

قاسم کی شجاعت :۔

یکت قاسم ہزاراں پر اٹھے یون اُن سواران پر
کہ جیوں بجلی ہے باراں پر کہو یاراں صد احد حیف

جلچہ ان کو شجاعت تھا سو روحق تھے عنایت تھا

یو سب ظاہر کرامت تھا کہو یاراں صد اصد حیف

امام قاسم کی شادی ہر مرثیہ نگاری کا عنوان رہا ہے اور اس پر ہر زمانہ میں خیال آرائی کی گئی ہے۔ مرزا نے اس عنوان پر مکالمہ کی شکل اختیار کی ہے۔ ایک بھولی بھالی دُلہن اور ذمہ داری محسوس کرنے والے دولہا کا مکالمہ قابل ملاحظہ ہے :-

کہے دیکھو نہایت لک یو ملنا ہے سو ساعت لک

جدائی ہے قیامت لک کہو یاراں صد اصد حیف

کہے بولو سو میرے تیں کہ پھر دیدار اب تو میں

ملوں گا بھی تمن سوں میں کہو یاراں صد اصد حیف

کہی اے شہ جوان کامل کہ لے آرام جانو دل

سبب ہے مج پر اب مشکل کہو یاراں صد اصد حیف

وقت نیں بات کہنے کا گھڑی تک ٹھیر رہنے کا

سبب ہے رنج سہنے کا کہو یاراں صد اصد حیف

دیکھو غمو کی غم سوں اب ہوا ہے سب جگر خون اب
رہے کیوں تاب منجکوں اب کہو یاران صدا صد حیف

منجے ہے کام اس دل سوں ہو تم صبر کی مل سون
صبوری ہور تو دل سوں کہو یاراں صدا صد حیف

اگر دیکھیں جن کی منجہ تیں تو اس جگ میں ملسوں کیں
قیامت کون ملوں گا میں کہو یاراں صدا صد حیف

یوسن عاروس دیکھے موں کے تمنا قیامت کون
پچھانوں کس نشانی سوں کہو یاراں صدا صد حیف

سونے یو بات غازی جون اپس تیں کاری جیوں
دیئے تب بہار را کھو یوں یاراں صدا صد حیف

کہ قائم جب ہوئے محشر تو منجکوں وان تمن ڈہنڈ کر
پچھا تو اس نشانی پر کہو یاراں صدا صد حیف

اسی مرثیہ میں امام قاسم کی ایک شجاعت کی تفصیل ملاحظہ ہو :-

تب اس چاروں کے داغان سیں دل ازرق ہوا پرخون
لپنے آیا مقابل کون کہو یاراں صدا صد حیف

حرُ کے متعلق بھی ہر ایک مرثیہ نویس نے مرثیے کہے ہیں۔ مرزا کا یہ مرثیہ خاص طور سے قابل ذکر ہے:۔

ابتدا اور تمہید

ادحسین ابن علی گوہر نبی کے دُرج کا   ادنور چاند سارا مرتضےٰ کے برج کا

جو گگن ہر شب گلان تاریاں سون ہو گلشن دسے

یوں چمن دل کا ایسی داغاں سوں سب رُدشن دسے

جوں سورج کی تاپ سون بیتاب ذرّے بیشمار

یوں ہوے سرداراں کے زیر و زبر او کی ہزار

ایک مبارک ذات پر کی بہار جوں بادل گھرے

یک وجود پاک پر کی تیر جوں بونداں پرے

شہادت کی تاریخ دن اور تعداد فوج کا ذکر:۔

شہ پو یوں جب دن گھر یا ماتم رہیا جگ ییں یو سوز

تب محرم کی دہم تاریخ تھا ہور جمعہ روز

شہ کنے چالیس پیادے تیس ہور دو تھے سوار
ظالماں کے دل منے تب تھے سواراں بیس ہزار

اس تمام صراحت کے بعد حُر کا ذکر شروع ہوتا ہے:۔
اس مخالف فوج میں حُر خاص منصدار تھے،
حر کے تابع تب سواراں یک ہزار اس ٹھار تھے

حر عمر سے گفتگو کرتے ہیں اور یزید کی فوج سے نکل کر امام حسین کے
طرف چلے آتے ہیں۔ امام سے ملاقات ہوتی ہے:۔
تب چلے آتے ہیں شہ سوں صدق اپنا جوڑ کر
دین کے منصب کوں لیتے او منصب چھوڑ کر
شہ کنے آ اس وقت تازی سوں او غازی ادتر
تب مبارک ہوں رکھے شہ کی رکاب پاک پر

او قدم جس کا دیکھو مشتاق سب آفاق ہے
بلکہ عرش و کرسی و لوح و قلم مشتاق ہے

شہنشاہِ دوجگ حر تے سنے یو بات جب

اس وقت حر پر ہوئے خوش حال ہو خرمے تب

آج ہے اے حر تہارے پر سعادت کا شرف

شاہی فیض ابد یعنی شہادت کا شرف

آج یو دن ہے کہ جا جد مصطفےٰ سوں مل رہیں

گلشن فردوس میں عیش سوں خوش دل رہیں

حر کی حیثیت مہمان کی ہے جو جنگ کی اجازت طلب کرتے ہیں امام اجازت نہیں دیتے کہ مہمان داری ضروری ہے۔ حر اصرار کرتے ہیں آخر امام مجبوراً اجازت دیتے ہیں :-

شہ جو یوں دیکھے کہ جو جن کا ہوا حر کا خیال

تب کہے اے حر نجا دیوں شتابی سوں اتال

تک اگر مہمان منج سوں توں رہے تو خوب ہے

اس وقت اے حر تیرا دیدار منجہ اپر دپ ہے

تب یو سُن حر یوں کہے اے سرورِ دوجگ کے آفتاب

اس سبب چلنے بداں ب تنصد منجکوں بے تتاب

تا اچھوں تیرے شہیداں میں یو من اول شہید
اس شرف سوں حشر کوں سب میں اچھوں افضل شہید

خوش ہوئے سلطان سرورجب سنے حر تے یو بات
تب دیئے حر کوں رضا او شہسوارِ کائنات

قبل ازیں اس امر کا ذکر ہو چکا ہے کہ دکھنی مرثیوں کا اصل مدعا غم و الم کے اظہار تھا۔ تاکہ مجلس عزا کو اشک بار کیا جائے بعض مرثیوں سے اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دکھنی مرثیوں میں رنج و غم درد و الم کا اظہار کس طرح ہوا کرتا تھا۔

زخم تن اوپر جیب لگے بے حساب　　پڑے سرور اس آن میں جون آفتاب
اٹھیا شور ہر شی میں اس وقت پر　　گیا ہانک یو عرش کے تخت پر
دھواں آہ کا اس گگن لگ گیا　　سورج غم سوں شعلہ ہو سب جل گیا
نہ کلثوم زینب کون طاقت رہیا　　نہ کچھ شہر بانو کوں راحت رہیا
جتے اہل معصوم ہور ہے تھے یتیم　　کھڑیا سب اوپر یو جفا ہور عظیم
دلے ہرگز ان کو نہ آرام تھا　　بجز آہ زاری نہ کچھ کام تھا

آیا عاشور جگ میں قیامت بنا ہوا　　ہر شی کون پھر حسین کا ماتم نوا ہوا

جل بل کباب غم تے ہوئے سب نبیاں کے دل　　پر خون جب اس دکھوں جگر مصطفے ہوا

عالم تمام غرق لہو میں ہوا کے نین　　یوں غم میں جب حسین علی مبتلا ہوا

رو رو ملک فلک میں لہو سوں بھرے دریا　　گویا عرش گگن پو دو جا کربلا ہوا

تارے نہیں عرش کے رنجو ہے گگن پو سب　　ساتوں طبق فلک میں حسین کا عزا ہوا

. . . .

نور دو چشم حیدر کرار تھا حسین　　ویسے اوپر یو ظلم و جفا کیوں روا ہوا

مرزا جکوئی نین سوں لہو اس دک کو سنا　　او سرخ رو دو جگ میں حضور خدا ہوا

کر و زاری محباں ہو یو دکھ پر دل جلایا ہے

حسین کا غم دو عالم کون رکت رنجو رلایا ہے

محرم چاند اس غم نے دیکھو کیوں خم ہو آیا ہے

شفق کے لہو میں غطہ کھا گگس میں تن چھپایا ہے

نبی کے آل کی کشتی ہوئی جب غرق اس لہو میں

فلک دیکھو چندر کشتی شفق کے لہو میں دوڑایا ہے

دنیا میں جب سینا مرزا حسین کا درد و غم تب سون
جگر پر زخم کاری ہو دل سب لہو میں نہایا ہے

ایک الوداع مرثیہ ملاحظہ ہو :—

الوداع الوداع شاہ شہیداں الوداع — اے حسین ابن علی دو جگ کے سلطان الوداع
شاہ دو عالم ہوا مظلوم حیراں الوداع — یوں چلیا دنیائے فانی سوں عزیزاں الوداع

یو شفق نہیں ہے گگن پر صبح و شام اس درد سوں — نت لبکا دیں لہو منی دامن گریباں الوداع
اس جفا کی نہہ پتی ہے گگن کے تن اوپر — نہیں ستارے پھر لو یو سب سنتے ہیں پیکاں الوداع

شہ کے غم کی ہانک گئی ہے عرش و کرسی تلک — سخت ہے یو غم جہاں میں نہیں ہے آساں الوداع
جب ہوا الوداع کاری فاطمہ کے دل اوپر — سب خوشی چھوڑا اس دکھ سوں رو الوداع

ہے محرم میں حسین کے درد سوں تازے ہزار — دل اوپر پھٹتے ہیں مرزا کے یو داغاں الوداع

مرزا کے سلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

حسین علی پر سلام علیک	دو جگ کے ولی پر سلام علیک
تو اے شاہ سرور سلام علیک	دو عالم کے سرور سلام علیک
توئی رہنما شاہ کونین ہے	حسین ابن حیدر سلام علیک
توئی نورِ چشم رسول خدا	تون سلطان محشر سلام علیک

. . . .

تیرا وصف لکھنے کون لوح و قلم	رہیا ہے مقصر سلام علیک
تیرا مدح مرزاں کے ایمان کا
ہوا زیب و زیور سلام علیک

صفحات ماقبل میں مرزا کے مختلف مرثیوں کا نمونہ پیش ہو چکا ہے۔ اگرچہ ہمارے مقررہ اصول اشعار کو کاتب مخطوطہ سے نقل کرنے کے باعث بعض غلطیاں ضرور ہیں لیکن ان کے قطع نظر اس امر کا صاف طور سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا کے مرثیے مضمون کے لحاظ سے ضرور اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنے والا کہنہ مشق مرثیہ گو معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون پر پوری طرح

حاوی ہے۔ اس کا انداز بیان پیچیدہ نہیں ہے۔ اس کے مرثیے اپنے زمانہ کے لحاظ سے صاف ہیں۔ وہ اپنے مرثیوں میں تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے۔ مگر اس میں بھی تصنع اور مبالغہ نہیں ہے۔ اس کے مرثیوں سے دکھنی مرثیوں کا خاص امتیاز بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ان کا مقصد مجلس عزا کو گرمانا اشک بار کرنا اور حقیقی طور پر بزم ماتم بنانا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ مرزا اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔

(رسالہ شہاب حیدرآباد بابتہ ۱۳۴۲ فصلی)

ارسطو جاہی ہندوستانی قصیدے

دکھنی شاعری کے جو نمونے اب تک دستیاب ہوئے ہیں، ان سے اس امر پر دلالت ہوتی ہے، کہ دکھنی شاعروں نے اولاً مثنوی کے میدان کو اپنی فکر اور اظہار خیال کا جولان گاہ بنایا تھا، مگر ساتھ ہی قصیدہ اور غزل بھی متروک نہیں تھی۔ تاریخوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ سلاطین قطب شاہی اور عادل شاہی کے درباری شعرا بادشاہوں کی مدح میں ہمیشہ قصائد پیش کیا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان کا بڑا حصہ ناپید ہے

ان کے قصائد کا جو حصّہ دستیاب ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ فارسی شعرا نے اپنے قصیدوں میں اسلوب بیان کے جو لوازم قرار دیئے تھے، وہی ان دکھنی شعرا نے بھی اپنے قصائد میں اختیار کر لئے تھے سلطان محمد قلی قطب شاہ علی عادل شاہ اور نصرتی کے قصائد سے اس بیان کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔

قصیدے کے لوازم تمہید (تشبیب) گریز، مدح، ممدوح، اس کے اوصاف ذاتی اور پھر تلوار، گھوڑے وغیرہ کی تعریف، آخر پر دعا، یہ سب دکھنی قصیدوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی عربی قصائد کی جو خصوصیات تھیں، ان کو بھی ان دکھنی شاعروں نے کافی طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ واقعہ نگاری کے بہتر سے بہتر نمونے دکھنی شعرا نے یادگار چھوڑے ہیں۔

قصیدوں کی زبان عموماً ادق اور وہ اپنے طرز ادا اور انداز بیان کے لحاظ سے مثنوی سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں طمطراق متانت، شوکت لفظی اور مضمون آفرینی وغیرہ کا خاص لحاظ ہوتا ہے۔

تشبیب بھی مختلف قسم کی ہوتی ہے، تشبیب کے بعد گریز کا موقع

آتا ہے، جو قصیدوں کی جان ہے۔ عربی قصائد کی طرح بعض دکھنی قصائد میں بھی گریز کے موقع پر لطافتیں پیدا کر دی گئی ہیں۔ گریز کے بعد مدح آتی ہے اس میں کن کن اوصاف کی تعریف ہونی چاہیئے۔ اس کے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی تالیف "شعر الہند" میں تفصیل سے بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ اردو کے ابتدائی قصائد (سودا) میں وہ اوصاف جو عربی محققین واضح کرتے ہیں نہیں ہیں۔ مگر یہ دعوے مبالغہ نہیں ہے۔ کہ دکھنی قصائد میں ان میں سے اکثر امور پائے جاتے ہیں۔

مگر اس وقت ہم کو دکن کے ابتدائی قصائد سے بحث نہیں ہے۔ بلکہ ایسے زمانہ کے قصیدوں کا تعارف مقصود ہے۔ جبکہ لکھنؤ میں مصحفی اور انشاؔ کا دور دورہ تھا۔

(۲)

سلطنت آصفیہ کے وزراء میں ارسطو جاہ کی شخصیت اپنی تدبر و قابلیت اور سیاست کے لحاظ سے خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے آپ کی سوانح حیات کے متعلق ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا ہے۔ میرا بھی ایک مضمون ارسطو جاہ اور روالاجاہ کی مراسلت کے متعلق شائع ہوا ہے،

آج ہم آپ کی مدح میں لکھے ہوئے بعض قصیدوں کا تعارف کراتے ہیں۔
ارسطو جاہ کی دیوانی کا زمانہ ۱۱۹۵ھ سے محرم ۱۲۱۹ھ تک ہے، یعنی مرنے تک وہ اسی خدمت جلیلہ سے سرفراز رہے۔ آپ کے دیوانی کے زمانہ میں سلطنت آصفیہ میں بڑے بڑے سیاسی امور رونما ہوئے، مرہٹوں سے لڑائیاں ہوئیں، ٹیپو سلطان سے معرکہ رہا۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں کی رقابت کا سلسلہ جاری رہا اور آخر فرانسیسیوں کا اثر ہمیشہ کے لئے زائل ہو گیا۔

اس وقت جن قصائد کا تعارف مقصود ہے۔ وہ ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۱۵ھ تک تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قصیدے ایک کتاب میں جمع کئے گئے ہیں اور اس کا نام "مجموعہ فصاحت" رکھا گیا ہے۔

اس کے جامع حیدرآباد کے مشہور مورخ اور ادیب شاہ تجلی علی تجلی ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہوئی ہے مگر معلوم ہوتا ہے ۱۲۱۶ھ تک اس کا کام جاری رہا کیونکہ جو تاریخیں اس کتاب کے متعلق نکالی گئی ہیں، ان سے ۱۲۱۶ھ ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں :-

(۱) ریاض قصائد (۲) قصائد اعظم (۳) دفتر وصف وزیر قابل وغیرہم
۱۲۱۶ھ ۱۲۱۶ھ ۱۲۱۶ھ

اسمٰعیل یار جنگ کی فرمائش سے یہ کتاب مرتب ہوئی ہے، اس میں فارسی اور اردو قصیدے، قطعات تاریخی شامل ہیں، ان کو شعرا کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار جمع کیا گیا ہے۔

یہ قصیدے ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۱۵ھ تک مختلف مواقع پر پیش ہوئے ہیں بعض ارسطو جاہ کے خطاب کی سرفرازی کے متعلق ہیں، بعض جشن سالگرہ اور جشن نوروز کے موقع پر پیش ہوئے ہیں، بعض عید الفطر اور عید الضحیٰ سے متعلق ہیں۔ کوئی ٹیپو سلطان کی فتح پر ہے۔ کوئی پونہ کی واپسی پر پیش ہوا ہے۔ کوئی تولد اولاد کی خوشی یا ان کی شادی بیاہ کے موقع پر پیش ہوئے ہیں۔

"مجموعہ فصاحت" نایاب ہے، اس کے دو حصے ہیں، ان کے منجملہ دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ سرکار عالی کے کتب خانہ میں ایک حصہ موجود ہے اس حصہ میں ردیف ص تک بیان ہوا ہے جس میں (۶۶) شعرا کے قصیدے اور قطعات شامل ہیں۔ دوسرے حصہ میں (۵۴) شعرا کے قصیدے وغیرہ ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ان کی فہرست حصہ اول میں شامل ہے۔ اس طرح (۱۲۰) شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں مکمل حصہ

موجود ہے ۔

زیر بحث مخطوطہ کا حجم (۴۹۲) صفحے کا ہے ہر صفحہ پر (۱۴) سطر ہیں نستعلیق میں لکھا گیا ہے، ابتدا میں ایک طویل فارسی دیباچہ بھی ہے۔ جو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے ۔

(۳)

شاہ تجلی علی المتخلص بہ تجلی امرائے دربار آصفی سے تھے، نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے ہمراہ رکاب رہا کرتے علمی قابلیت بہت اچھی تھی، عربی اور فارسی کے بڑے ماہر تھے، فارسی اور اردو کے بہترین شاعر تھے تصنیف و تالیف کا بڑا شوق تھا۔ "تزک آصفیہ" جو سلطنت آصفیہ کی مستند تاریخ ہے آپ کی یادگار ہے ۔

شاعری کے ساتھ مصوری اور خطاطی میں بھی ید طولےٰ رکھتے تھے، بڑے متواضع منکسر المزاج تھے، ہر شخص کے ساتھ اخلاق سے ملا کرتے سامرائے عظام یعنی ارسطو جاہ، امیر کبیر شمس الامرا امیر عالم وغیرہ سے آپ کو خاص اتحاد تھا۔ آپ کے دختر کی شادی میں آصف جاہ ثانی نے آپ کے مکان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کیا تھا۔

تجلی کا انتقال ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔ حیدر آباد کے محلہ یاقوت پورہ میں دفن ہوئے۔

شاہ معین تجلی سے آپ کو بیعت تھی۔ ان سے خلافت بھی حاصل ہوئی تھی جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں (۶۶) شعرا کے قصیدے اور قطعات شامل ہیں۔ ہندوستانی قصائد کی تعداد (۶۸) اور قطعات دو سو سے زیادہ ہیں۔ فارسی قصائد اور قطعات اس کے علاوہ ہیں۔

بلحاظ ردیف شعراء کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

الف ۱۸ شعرا۔ ب ۳ شعرا۔ ت ۵ شعرا۔ ث ایک شاعر۔ ج ۴ شعرا چ ایک شاعر، ح ۶ شعرا۔ خ ۲ شعرا۔ ذ ۲ شعرا۔ ر ۴ شعرا۔ ز ۳ شعرا۔ س ۹ شعرا ش ۶ شعرا، ص ۲ شعرا۔

سب سے زیادہ قصیدے تجلی کے ہیں۔ جن کے اردو قصائد کی تعداد دس ہے۔ اس کے بعد احسن کے نو قصیدے ہیں، سب سے طویل قصیدہ تجلی ہی کا ہے جس کے ایک سو چالیس شعر ہیں۔

کئی شعراء کے قصیدے ایک ہی قافیہ و ردیف میں ہیں، مثلاً ردیف "دست" اس میں تجلی، ایما، سحر کے قصیدے ہیں۔ ہر ایک کا مطلع ملاحظہ ہو

تجلّی :-

گر وصل گلبدن دے مجھے ایک بار دست   ہر مو سے بہرِ شکر ہوں پیدا ہزار دست

ایمار :-

بے زر جہاں میں کچھ نہیں آتا بکار دست   بدتر ہے آستیں سے بے اقتدار دست

سحر :-

یارب دے اوس کا یوں مجھے بوس و کنار دست   لب لب سے بر سے بر گلے میں ہو ہار دست

"وزارت" کی ردیف میں ایمان اور ایما دونوں کے قصیدے ہیں :-

ایمان :-

پیدا ہے تیرے چہرہ سے یہ شانِ وزارت   جو دیکھے سو بولے کہ ہے شایانِ وزارت

ایما :-

پھبتی ہے تجھے نام خدا شانِ وزارت   ہے ذات مقدس تری شایانِ وزارت

مزید طوالت کے خوف سے ہم صرف بعض قصائد سے تشبیب، گریز، مدح کے اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :-

تشبیب

بحمد اللہ مجھ تک صبحدم پیکِ صبا پہنچا   نوید دولتِ جاوید کو لیتا ہوا پہنچا

کہا مجھ سے کہ اب کیونکر نہ ہو گل گل شگفتہ تو — کہ داماں اجابت کو ترا دستِ دعا پہنچا
تو اپنے عقدۂ دل کو کیا یک کھول جیوں غنچہ — ترا بھی مقصدِ دیرینہ ناحاجت روا پہنچا

ایمان

ہیں اب کے ایک سال میں پیدا بہار دو — ایک گل پہ جھوم جھوم کر آئے ہزار دو
گل کوئی شمع کوئی سمجھ بلبل و پتنگ — قربان ہیں صبح شام بصد اضطرار دو
سیلاں ہے بسکہ جوش رطوبت سے باغ میں — سرو چمن کے بیچ ستے جوئبار دو
موج نسیم آئینہ آبشار سے — صیقل سا صاف کر دیا رنگ غبار دو
یہاں تک نمو کا زور ہے نکلے زمیں کو چیر — یک بیج سے گلوں کی بھری شاخسار دو
مثل دو دست بذل و بخشش جہت کے بیچ — جاری ہوئے ہیں نہروں سے اب آبشار دو
دل چاہتا ہے آج رگ گل میں گوندہ گوندہ — پہنوں میں کر کے عطر سے پر دردہ ہار دو

تجلی

جلوۂ حسن شفاق کے کہوں کیا میں مثل — آتش طور بھڑکتی ہے بہر دشت و جبل
رنگ ہے تنگ چمن پر کہ تماشا کیلئے — شاہد نکہت گل آئی ہے پردہ سے نکل
جوش یکرنگی ہے یہاں تک چمن چاہی ہے — آشنائی سے کرے سبزہ بیگانہ بدل
باعث صافی مرآت سکندر ہر حوض — موجب آبروئے عین لبقا ہر منہل

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

زرپاشی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب — رکھتا ہے اپنے چہرہ پہ ہو شرمسار دست

بذل و سخا و جود و کرم فیض و لطف و خلق — کھولے ہیں تیرے سامنے ہفتاد یار دست

حلقہ میں تیرے دام کے ہوں سر چرخ صید — کردے ہے جب بلند تو بہر شکار دست

تیری سخا کا پایۂ عالی ہے یوں بلند — پہنچا نہیں سپہر کا واں زینہار دست

ہو گئے ہیں تنگدست جہاں کے کشادہ دست — پایا ہے جب کرم سے تیرا اشتہار دست

تجلی

اے کرم بخش جہاں فیض عبادت تیری — سینہ دریا ہے صدف دل ہے اور ایماں گوہر

تجھ سے سائل ہو جو ایک جو کا کوئی وقت نماز — دیوے گندم کی جگہ تول کے قرآں گوہر

لب سے شاہا تیرے نکلے ہے سخن بھی دُر ریز — ہیں ہم شیر و شکر لعل و بدخشاں گوہر

احسان

تجھ تیغ آبدار کا اے دستیار خلق — اوچھا سا گر لگے بسر کوہسار دست

گاؤ زمیں سے کاٹ کے چورنگ تا بہ تخت — ذرہ خطا کرے نہ تیرا زینہار دست

ایہام

جس جائے زور بازو کا مذکور ہو تیری — حسرت سے کاٹنے لگے اسفندیار دست

رستم تیرے حضور ہے ایک ہنسہ پہلوان — پنجہ سے کب کرے تیرے بر دو چار دست

سرمہ کی طرح خاک ہوا ایک ہی فشار میں   کر دیوے سنگ لاخ کو نیر افشار دست

ایہام

ولدل نسب براق حسب ہے ترا کمیت   خنگ فلک ہے اس سے فروتر ہزار دست
جب تھان سے کھلے ہے وہ گلگشت کیلئے   باندھی ہے اس کے روبرو باد بہار دست
عرصہ یہ شش جہت کا نہایت ہی تنگ ہے   مت ڈال اس کی باگ پہ اے شہسوار دست
ٹھہرے نہ وہ زمین پہ پھر آسماں سوا   گر اوس کی پاے وہم دے اضطرار دست

ایہام

ہاتی تیری سواری کا اتنا ہے سربلند   پہنچائے آسماں تک اس کا سوار دست
خوبی سیاہ سینہ کی اس کی میں کیا کہوں   ملتا ہے جس کو دیکھ کے ابر بہار دست

ایہام

رائے انور کی تیری وصف رقم کرنے کو   دمبدم صبح کرے ہی زر خورشید کو حل
بذلہ گوئی ہے تیری ہم نفس سحر حلال   اور شکر ریزی گفتار ہے ہم شان عمل
کیا عجب وقت سخن فیض ترا ہے لب سے   شیریں ہو جائے اگر ایک ہی دم میں حنظل
تا کجا شرح کروں میں تیرے اوصاف کو اب   خرق عادت سے غرض کم نہیں یہ حسن عمل

سخن

بسم الله

کتاب کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے مضامین سے آگاہی ہو جائے۔

یہ کتاب چار ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے باب میں اردو شاعری کے آغاز پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد قدما کا پہلا دور شروع ہوتا ہے جس میں اردو شاعری کی تجدید اور اصلاح کا بیان ہے۔ اسی سلسلہ میں میر و مرزا (میر تقی اور مرزا سودا) کے کلام کا موازنہ اور مقابلہ بھی کیا گیا ہے اس کے بعد قدما کا تیسرا دور آتا ہے جس میں "لکھنؤ میں شاعری کا آغاز" پر بحث کی گئی ہے اور مصحفی اور انشا کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس بحث کے بعد تلامذہ شعرا، قدیم کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ جس میں خان آرزو مرزا مظہر جان جاناں شاہ مبارک آبرو مصطفےٰ خان یک رنگ۔ شرف الدین مضمون شاہ حاتم۔ میر۔ سودا۔ میر درد۔ میر سوز۔ انشا۔ میر حسن۔ جرأت۔ مصحفی۔ بقا۔ دیوانہ ضیا۔ حزین۔ الہام۔ ندیم۔ فغان۔ بیدار۔ حسرت۔ فقیر اور قدرت کے (۹۱) شاگردوں کا نہایت مختصر ذکر ہے اور ایک ایک دو دو شعر بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تتبعین شعرائے قدیم کا عنوان آتا ہے۔ اس عنوان میں بتایا گیا ہے۔ کہ کن کن شعرا نے کن کن شعرا کا تتبع کیا۔ اس کے خاتمہ

پر باب اول ختم ہو جاتا ہے ۔ جو (۱۸۸) صفحوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب
میں "متوسطین کا پہلا دور" شروع ہوتا ہے ۔ اس کی ابتدا شیخ ناسخ سے ہوتی
ہے ۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے ۔ کہ شیخ ناسخ نے کیا کیا تبدیلیاں
کیں اور اسی سلسلہ میں ایک آخری تبدیلی الفاظ کی تبدیلی ہے ۔ جس کی ایک
طویل فہرست "جلوہ خضر" سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کو " اردو
شاعری کے دو مختلف اسکول" کا عنوان ملے گا ۔ جس میں دلی اور لکھنو کے
خصوصیات کلام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور شیخ ناسخ اور خواجہ آتش
کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد "اساتذہ دہلی" کا عنوان آتا ہے ۔ جس
میں اس دور کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور شاہ نصیر ۔ ذوق ۔ غالب
اور مومن کے علیحدہ علیحدہ رنگوں کو دکھایا گیا ہے ۔ اس کے ختم پر "متوسطین
کا دوسرا دور" شروع ہوتا ہے جس میں تلامذہ آتش و ناسخ پر بحث کی گئی
ہے اور بتایا گیا ہے ۔ کہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے بعد اردو زبان اور
اردو شاعری کی اصلاح میں جو کمی رہ گئی تھی، اس کو اُن کے تلامذہ نے
نہایت جامعیت کے ساتھ پورا کیا ۔ اسی سلسلہ میں آپ کو تلامذہ غالب ۔ مومن
کا بیان بھی ملے گا ۔ جو شیفتہ ۔ ذکی ۔ مجروح ۔ حالی ۔ انور کے مختصر کلام پر مشتمل

ہے۔ اب دوسرا باب جو (۹۹) صفحات میں ہے ختم ہو جاتا ہے اور تیسرے باب کی ابتدا ہوتی ہے جس میں "متاخرین کا پہلا دور اور ریاست رام پور" کا عنوان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں اور کلب علی خاں کی قدر دانیوں نے رام پور کو اساتذہ لکھنو اور دہلی، دونوں کی شاعری کا مرکز بنا دیا اور ان کی فیاضانہ کشش نے مومن۔ غالب۔ داغ اسیر۔ امیر۔ منیر۔ بحر۔ خلق۔ تسلیم۔ ضیا اور جلال وغیرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں داغ اور امیر کا موازنہ بھی درج ہے۔ اس کے بعد "متاخرین کا دوسرا دور" شروع ہوتا ہے۔ اس میں تلامذہ داغ اور امیر کا بیان ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ رام پور میں دلّی اور لکھنو کی شاعری کے اختلاط نے جو نیا رنگ پیدا کر دیا تھا، اس کو ان لوگوں نے اور بھی چمکا دیا۔ اس بیان پر تیسرا دور جو (۷۰) صفحوں میں ہے ختم ہوتا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان "دورِ جدید" ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے ہمارے شعرا کے سامنے کیا کیا اصلاحی مطالبات پیش کئے اور "مقدمہ حالی" سے یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ اردو شاعری کے متعلق مولانا نے کیا کیا اصلاحی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اور پھر

مولانا کی شاعری کے نمونے دیئے گئے ہیں - اس کے بعد حسرت موہانی وفا رامپوری - شوکت علی فانی - محمد علی جوہر - اصغر حسین اصغر - علی محمد شاد - عزیز لکھنوی - شبیر حسین جوش کا کلام نمونۃً پیش کیا گیا ہے -

اس کے بعد وطنی شاعری - اخلاقی شاعری - سیاسی شاعری - نیچرل شاعری - مناظر قدرت - وصف نگاری - ظریفانہ شاعری - قومی شاعری - تاریخی شاعری کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے جس میں حالی - شبلی - اقبال - اکبر - محمد اسمٰعیل وغیرہ کا کلام پیش کیا گیا ہے -

اخیر میں "متفرق نظموں" کا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں انگریزی نظموں کے ترجموں کا ذکر ہے - اس طرح یہ باب (۸۶) صفحوں پر ختم ہوتا ہے

کتاب کے مضامین و مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب میں نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں - مجھے یہ دیکھنا مقصود ہے - کہ آیا فاضل مؤلف نے دکن کی ادبی خدمات کو نظر انداز کر دیا ہے - یا جیسا کہ چاہئے تھا - اُن کا تذکرہ کیا ہے - یہ تو نہیں کہا جا سکتا - کہ انہوں نے دکن کے حقوق ادا کرنے سے دریغ کیا ہے - تاہم دکن کے متعلق انہی جو معلومات بہم پہنچائی ہیں - اُن میں بعض فروگذاشتیں ہیں، اور بعض کمیاں

رہ گئی ہیں۔ جن کو میں ذیل میں مختصراً بیان کرتا ہوں:۔

۱۔ دیباچہ میں مولانا نے اُردو کے تذکروں کی فہرست دی ہے اور اس میں بجولہ گارسن ڈی ٹاسی اور چند دیگر تذکروں کا ذکر کیا ہے مگر اس میں دکن کے کسی تذکرہ کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ دکن میں بھی کئی ایک تذکرے لکھے گئے ہیں۔

۲۔ اردو شاعری کے آغاز کو مختصر طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔ جو ناکافی اور تشنہ ہے۔ ابتدائی شاعری جو دکن سے وابستہ ہے اس کے متعلق قابل مؤلف نے اول تو کچھ نہیں لکھا ہے۔ جو لکھا ہے۔ وہ تحقیق اور وسعتِ معلومات پر مبنی نہیں معلوم ہوتا مثلاً:۔

(ا)۔ لکھتے ہیں۔ کہ "سلطان قلی کے مجموعہ کلام کو دیوان سے موسوم کیا گیا ہے" اس جملے سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ دراصل دیوان نہیں ہے۔ حالانکہ سلطان قلی کا مجموعۂ کلام بالکل اسی طرح مرتب ہوا ہے جس طرح آج کل کے کلیات اور دیوان مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں اصنافِ سخن سے مثنویاں۔ غزل قصیدے۔ رباعیات وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ باوجود اس کے اس کو دیوان نہ کہنا خالی از تعجب نہیں۔

ب۔ ''غواصی نے طوطی نامہ بخشی کو نظم کیا۔ جس کا ایک مصرع ہندی اور ایک مصرع فارسی تھا''۔ حالانکہ یہ کتاب ایسی نہیں۔ بلکہ بالکلیہ دکھنی نظم ہے۔

ج۔ اسی طرح ''مثنوی من لگن'' کا ذکر بالکل سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کی بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں عالمگیر کے منہ پر اس کی کلی حقیقت بیان کردی گئی ہے اور اس کے کیرکٹر کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے۔

د۔ ''اردو شاعری کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا اور ولی کے زمانہ تک مذہبی خیالات شاعری کا جزو غالب رہے۔ اس لئے معاصرین ولی نے جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ مناجات اور مناقب وغیرہ پر مشتمل تھا''۔

یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ولی سے بہت پہلے ہمیں ایسا کلام نظر آتا ہے۔ جو مناظر قدرت واقعات روزمرہ تاریخی نظم۔ اخلاقی نظم وغیرہ پر مشتمل ہے۔ وجہی۔ نصرتی ابن نشاطی قطب شاہ۔ رستمی۔ غواصی۔ خوشنود شیدا۔ مومن وغیرہ کی مثنویوں اور کلام سے اس کا بخوبی ثبوت مل سکتا ہے مضمون کی طوالت کے خوف سے نمونے متروک کئے گئے۔

۳۔ ''اردو کا مکمل خاکہ عالمگیر کے زمانہ میں تیار ہوا لیکن اس کی داغ بیل

عالمگیر کے زمانے سے بہت پہلے پڑ چکی ہے"۔ ص ۱۲

یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مکمل خاکہ بھی اس سے پہلے تیار ہو چکا تھا۔ دکن میں عالمگیر سے پہلے بیسیوں شاعر مثلاً نظامی۔ وجہی ابن نشاطی۔ غواصی احمد جنیدی۔ شاہی مرزا۔ شعور۔ رستمی۔ نصرتی۔ ہاشمی وغیرہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار کی زینت بنے ہوئے تھے۔ سخن فہم بادشاہ قطب شاہ۔ شاہی عبداللہ وغیرہ خود بھی باکمال شاعر تھے۔ شعرا کی مثنویاں، قصیدے، غزل اور مرثیے ترجیع بند اور رباعیاں آج تک محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ بیجاپور کی سرکاری زبان ۹۶۵ھ میں دکنی ہو گئی تھی۔ اس لئے یہ کہنا کہ عالمگیر کے عہد میں اردو کا مکمل خاکہ تیار ہوا درست نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جہانگیر کے زمانہ میں ملا نوری ایک شاعر تھے۔ جو اگرچہ عام طور پر فارسی زبان میں شعر کہتے تھے لیکن ان کے قلم سے ایک آدھ مصرع اردو کے بھی نکل گئے ہیں۔ مثلاً

ہر کس کہ جنابت کند البتہ بترسد   بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ نوری بیجاپوری ہیں

۵۔ ولی کے متعلق لکھا گیا ہے۔ کہ ولی جب تک دکن میں رہے۔ ان کا

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا ‏ ‏ کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

پردۂ چشم اٹھا دیدہ تحقیق سے دیکھ ‏ ‏ جب یگانہ وہ ہوا کوئی نہیں بیگانہ

ہمیں کیا کام ہے دونوں جہاں سے ‏ ‏ ترا ملنا ہمارا مدعا ہے

ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے کئی باکمال آسمانِ شہرت پر آفتاب ہو کر چمکے۔ مگر تعجب ہے کہ شعرالہند میں ہمیں سوائے ولی اور سراج کے سرسری ذکر کے کسی کا کلام نہیں ملتا۔ اور خود ولی اور سراج کے بھی جو اقلیم سخن کے بادشاہ تھے۔ بالکل مختصر بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

چند باکمالوں کے نام اور ایک ایک دو دو شعر مثال کے طور پر درج کئے جاتے ہیں:۔

فقر اللہ آزاد جو ولی کے ہمعصر تھے:۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں ‏ ‏ پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

داؤد متوفی ١١٦٨ھ

اس صنم کے خیال ابرو نے　　ناتواں مجھ کو جوں ہلال کیا

چاندنی کی سیر کو کس طرح نکلے وہ صنم　　دیکھنے مہ کا تماشا آفتاب آتا نہیں

موزوں برہان پور کے قلعہ دار تھے :-

موزوں نے راہِ عشق میں پھر اب قدم رکھا　　ہے مصلحت سے دور نہ جانے کرے گا کیا

سرمہ گر ابرو سے اپنی وہ خوش ابرو پونچھے　　گردِ خجلت کو سدا دیدۂ آہو پونچھے

آستیں کاہیں کسو کی نہ ہوا دستِ نگر　　میرے ہی ہاتھوں نے آخر میرے آنسو پونچھے

فیض متوفی ۱۲۸۲ھ جن کے دامنِ فیض سے صدہا اشخاص فیضیاب ہوئے :-

کفر جو تھا دین میرا ہو گیا　　بت ہی نصیبوں سے خدا ہو گیا

تقاضا دیت کا مگر فیض ان سے　　خدا سے کوئی خوں بہا چاہتا ہے

اڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے　　مگر نہ قبضہ میں دامانِ آرزو آیا

نہ کر اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار　　ابھی اے فیض مر مر کے جیا ہوں

میر احمد علی عصر. شاگرد فیض :-

کام کب تدبیر سے ہو جب نہ ہو تقدیر میں　　طالع بیدار میرا رات بھر سویا کیا

غریق بحر محبت ہوں عصر بعد فنا　　گرا نہ لاش بھی اپنا کچھار کے باہر

مدفن میرا میرے لئے گلزار بن گیا　　زیر زمیں بھی چین سے ہوں میں مزار میں

گُل کر دیا چراغ تمنّا بجھا دیا　　میری طرف سے اس کو کسی نے لگا دیا

غرض اس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ دکن میں بھی ایسے باکمال موجود تھے جن کا تذکرہ شعرالہند میں ضروری تھا۔ اگر ان کی مزید صراحت کی ضرورت ہو۔ تو ناچیز کی تالیف "دکن میں اردو" ملاحظہ فرمایئے [1]

(۷) تلامذہ داغ اور امیر کا خاص عنوان بھی مقرر کیا گیا ہے صفحہ ۳۲۴ امیر اپنی زندگی کے آخری حصہ میں اور داغ ایک عرصہ تک حیدرآباد میں مقیم رہے

---

[1] جس کا اب تیسرا اڈیشن بہت کچھ ترمیم اور اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے۔

جس کے باعث یہاں کئی ایک نامور شاگرد ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ شعرالہند کے صفحات میں کسی کا نام نظر نہیں آیا۔ داغ کے شاگردوں میں حضرت آصف کیفی، امیر، مزاج، آزاد وغیرہ ایسے افراد ہیں، جن کا کلام مشہور زمانہ ہے، اسی طرح امیر کے شاگرد مولوی عبدالواسع صفا اور اختر وغیرہ ہیں:۔

یہ موقع نہیں کہ ان اصحاب کے کلام پیش کئے جائیں۔ مگر بطور نمونہ صرف آصف کے ایک دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

حضرت آصف

واہ اے شان کریمی ترے صدقے قربان　　جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا

یہ شب وصل ان کو حسرت ہے　　شام ہوتے ہی کیوں سحر نہ ہوئی

مقابل یوں ملے جب حسن کی داد　　ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہات　　واہ واہ دزد حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

نظمیں یہ سب خاص طور پر ذکر کے قابل تھیں مضمون کی طوالت کے خوف سے اُن کی مثالوں کو نظر انداز کرتا ہوں۔ دورِ جدید میں ان لوگوں نے جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اس کا کامل ثبوت "دکن میں اردو" سے مل سکتا ہے۔

(۹) انگریزی نظموں کے ترجموں میں مولانا نظم طباطبائی کا خاص درجہ ہے مثلاً "گورِ غریباں" وغیرہ اس کا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔

غرض اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں۔

بہرحال اگر ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کریں۔ جو کتاب کی کامل کامیابی میں حائل ہیں، تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ اب تک اردو کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں۔ اُن میں یہ تذکرہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور ان سے کہیں زیادہ معلومات و تحقیقات پر حاوی ہے۔ خاص طور پر یہ امر غنیمت ہے۔ کہ اس کے مؤلف نے دکن کو قابلِ لحاظ سمجھا اور اگرچہ اُسے اردو کی تاریخ میں وہ مستقل درجہ نہیں دیا جس کا وہ اپنی کارگذاریوں کے لحاظ سے مستحق ہے اور اس کا ذکر اس شرح و بسط سے نہیں کیا جس کی اردو کی ایک مجموعی تاریخ سے توقع

ہونی چاہیئے تھی۔ تاہم اس کے ذکر کو اس قابل سمجھا۔ کہ اس کتاب میں شامل کر لیا۔

ابھی دیکھیئے وہ دن کب آتا ہے۔ جب دکن کے حقوق پورے تسلیم کئے جائیں گے۔ بہر حال آثار موافق حال ہیں۔

(رسالہ ہزار داستان لاہور جلد نمبر ۲ نمبر ۴ر ۵)

انڈیا آفس کی کیٹلاگ میں دکھنی مخطوطات کی فروگذاشتیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس کی ہندوستانی مخطوطوں کی کیٹلاگ نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کی ہے اور بہترین معلومات کو جمع کر دیا ہے، مگر جہاں یہ کوشش قابل ستائش ہے وہاں چند فروگذاشتیں بھی ہوئی ہیں، مخطوطوں میں سب سے قدیم دکھنی کہے جا سکتے ہیں، ان کے متعلق میں نے کسی قدر تفصیل سے کام کیا ہے۔ دوران ریسرچ میں مجھ کو اُن کے متعلق جو فروگذاشتیں معلوم ہوئیں، یہاں ان کی صراحت کی جاتی ہے

آخرالذکر کے غلط ہونے کے متعلق میں نے اپنے نوٹ متعلقہ برٹش میوزیم میں صراحت کی ہے اور ان کے تصانیف وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

"نصرتی" کی تصنیف "گلشن عشق" کے سنہ تصنیف کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہے جو ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء ہے اور خود نصرتی کے کلام سے اس کی تائید اور توثیق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:-

کیا اس کی تاریخ یوں ہجرتی　　مبارک یوہی ہدیہ نصرتی

مگر "علی نامہ" کے سنہ تصنیف کے متعلق اختلاف ہے، بلوم ہارٹ نے ۱۰۷۱ھ لکھا ہے (صفحہ ۱۶ سطر ۹) نہیں معلوم یہ صراحت کس بنا پر کی گئی ہے،

"علی نامہ" میں ملناڑ کی فتح کا قصیدہ شامل ہے اور یہ فتح ۱۰۷۴ھ میں ہوئی ہے۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ علی نامہ اس کے بعد مرتب ہوا ہوگا چنانچہ برٹش میوزیم کے مخطوطے سے اس کی تصنیف ۱۰۷۶ھ ظاہر ہوتی ہے، اس کی توثیق میں ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں،

لکھا شہ کا بیں جب جو یو کر ادس　　ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس

دلی ہی ہوں یو حق سنے امید وار　　کہ شہ جم جیو فتح پانی آپار

. . . .

الا نصرتی ختم کر یو کلام   دعا سوں کہ تج مدعا ہے تمام

مصنف کیٹلاگ کتب خانہ ٹیپو سلطان نے اس کی تصنیف کا سنہ نہیں دیا ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے صرف گلشن عشق کی صراحت کی ہے،

۴۔ مجموعۂ مثنویات (نمبر ۱۲۲ مسہ ۱۶۴) اس مجموعہ میں تین مثنویاں ہیں جن میں سے دو کے نام اور مصنف کے نام ظاہر کئے گئے ہیں۔ مگر تیسری بلا صراحت ہے۔ جو مثنویاں نام کے ساتھ درج ہیں۔ وہ :۔

ا۔ مثنوی پھول بن

ب۔ مثنوی روضۃ الشہداء ہیں۔

تیسری کتاب جو بلحاظ سلسلہ II ہے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مگر افسوس کہ کیٹلاگ سے کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی، اس مثنوی کا نام درج ہے اور نہ مصنف کا، لہٰذا اس کی صراحت کی جاتی ہے،

قطب مشتری ہیں جو بولیا کتاب   ہوئی جگ ہیں روشن جیوں آفتاب

اس مثنوی کا مصنف وجہی ہے، اشعار ذیل سے اس کی بخوبی تائید ہوتی ہے:

وجہی ترا ذہن جیون برق ہے   تجھی ہور بعنیاں یں کئی فرق ہے

[illegible]

۲. تاریخ تصنیف سیف الملوک،

غواصی کا شیعہ ہونا نہیں معلوم بلوم ہارٹ نے کس طرح معلوم کیا ہے، کوئی ثبوت تائید میں بیان نہیں کیا گیا،

غواصی کے کلام سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ شیعہ نہیں تھا، بلکہ سنی تھا خلفائے راشدینؓ اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کے علاوہ برٹش میوزیم کے ناقص نسخہ میں حسب ذیل شعر ہے۔ جو غواصی کے مذہب پر کافی روشنی ڈالتا ہے

فدا ہوں انکی دلیوں کے اوپر   سنو رافضی خارجی کاٹ کر

غواصی کے حالات بہت کم معلوم ہوئے ہیں۔ مگر کیٹلاگ تو بالکل ساکت ہے غواصی دور قطب شاہی کا نامور باکمال شاعر ہے اس کی قابلیت کی تعریف ملک الشعرا بیجاپور نصرتی نے گلشن عشق میں کی ہے، اب تک اس کی دو تصنیفات کا پتہ چلا ہے۔

ا۔ سیف الملوک و بدیع الجمال۔

ب۔ طوطی نامہ،

اول الذکر ۱۰۳۵ھ میں آخر الذکر ۱۰۴۹ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

طوطی نامہ کا ذکر اسپرنگر نے بھی کیا ہے، اس کی کٹیلاگ میں

ہے جس میں شعر اس طرح درج ہے :-

برس یک ہزار اور پنج تیس میں — کیا نظم یو [illegible] تیس میں

برٹش میوزیم والی میں "بجائے پنج بیس" درج ہے۔ کاتب کی سہو معلوم ہوتی ہے بہرحال اس کی تصنیف ۱۰۳۵ھ میں ہوئی ہے۔

۲- روضۃ الشہداء نمبر ۲ صفحہ ۹۹: اس کے متعلق بھی تین فروگذاشتیں ہوئی ہیں:

ا- اس کو ولی گجراتی کی تصنیف بتایا گیا ہے۔

ب- خود ولی گجراتی کے وطن کی صراحت غلط ہے۔

ج- تخلص کو "ولی شاہ" بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اس امر کی وضاحت کرنی چاہیئے۔ کہ یہ اس ولی کی تصنیف نہیں ہے جس کا دیوان مشہور ہے۔ دکن میں ولی تخلص کے دو شخص ایک ہی زمانے میں گذرے ہیں: ولی اورنگ آبادی، ولی ویلوری؛

روضۃ الشہداء در اصل ولی ویلوری کی تصنیف ہے جیسا کہ مولانا محمد باقر آگاہ نے اپنی تصنیف ریاض الجنان کے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے چونکہ آگاہ کا وطن ویلور سے قریب تر ہے، اور چونکہ خود آگاہ بھی ویلوری ہی کے ہیں۔ اس لئے روضۃ الشہداء کو ولی ویلوری کی تصنیف قرار دینا ضروری ہے۔

اسپرنگر کے کیٹلاگ میں یہ کتاب داخل نہیں ہے، اشٹوارٹ (Stewart) نے مصنف کے متعلق کچھ وضاحت نہیں کی ہے۔

علاوہ ازیں ولی جس کا دیوان مشہور ہے، اس کے حالات عام طور سے معلوم ہیں اور اکثر قدیم و جدید تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر کسی قدیم دکھنی یا شمالی ہند کے تذکرہ نویس نے روضۃ الشہدا کو ولی کی تصنیف نہیں بتایا ہے اس بیان سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ روضۃ الشہدا ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ ان کے صحیح نام کے متعلق کسی قدر شبہ ہے مؤلف اردو کے قدیم نے محمد حسن ظاہر کیا ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سرورق پر میر ولی فیاض درج ہے آگاہ نے نام کی صراحت نہیں کی ہے۔

روضۃ الشہدا کی تصنیف ۱۱۳۰ھ میں ہوئی ہے، جیسا کہ انڈیا آفس اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ ذیل کے شعر سے اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔

کیا ہوں ختم جب یو درد کا قال　　اگیارہ سو او پر تھا تیسوں سال

اس کے بعد ولی گجراتی کے متعلق یہ صراحت کرتی ہے کہ ولی کو احمد آباد گجرات سے تعلق نہیں تھا۔ انکا اصلی وطن اورنگ آباد ہے۔ ولی اورنگ آبادی کے وطن کے متعلق مختلف

اصحاب نے بحث کی ہے اور اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ اورنگ آباد ان کا وطن تھا چنانچہ حال میں مؤلف کلیات ولی نے بھی اس پر کافی بحث کی ہے اور ذیل کے اشعار ان کے دکھنی ہونے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں :-

دکھ کی شمع سوں روشن ہی ہفت اقلیم کی مجلس　　ولی پروانگی کرتا تری ملک دکن بہتر

ولی ایران و توران میں ہے مشہور　　اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

علاوہ ازیں خود انڈیا آفس کے ایک نسخہ سے (ب $\frac{115}{6.62}$) جس کو ابوالمعالی کے فرزند نے مرتب کیا ہے، ان کا دکھنی ہونا بخوبی ثابت ہوتا ہے، یہ ابوالمعالی وہی صاحب ہیں جن کے ساتھ ولی نے دہلی کا سفر کیا تھا۔

تیسری فروگذاشت یہ ہے کہ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے۔ کہ شاعر نے خود کو "ولی شاہ" سے بھی موسوم کیا ہے (صفحہ ۵۹ سطر ۱۸) جس شعر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

ولی شاہ ولایت سوں مدد منگ　　اتار کر مجلس ششم میں اہنگ

حالانکہ اس کا سرسری ملاحظہ بھی اس امر کو ظاہر کر دیتا ہے۔ کہ "شاہ" کی اضافت ولایت کی طرف ہے۔ نہ کہ ولی کی طرف، شاہ ولایت سے حضرت علیؓ مقصود ہیں

میں شعر کہا کرتے، تاریخ گوئی کا خاص ملکہ تھا، ۱۱۸۷ھ میں انتقال ہوا،

(از چمنستان شعراء)

اسپرنگر نے لال گوہر کے مصنف کے ذکر میں صرف عاجز پر اکتفا کیا ہے۔ مزید صراحت نہیں کی،

مصنف کیٹلاگ کتب خانہ ٹیپو سلطان نے تخلص بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔

اسی مخطوطے کے ضمن میں بلوم ہارٹ نے ملکۂ مصر اور قصۂ فیروز شاہ کو ایک ہی ظاہر کیا ہے (صفحہ ۵۹ سطر ۲) حالانکہ یہ صحیح نہیں جیسا کہ قبل ازیں بتایا گیا۔

(۹) قصۂ ابو شحمہ (نمبر ا، صفحہ ۳۴) اس کے متعلق بتایا گیا ہے۔ کہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے جس کو مصنف نے اپنی سولہ سالہ عمر میں سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں لکھا تھا (سطر ۱۶)

یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ خود کتاب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی تصنیف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ہوئی تھی چنانچہ ذیل کے مدحیہ اشعار سے اس کی تائید ہو سکتی ہے :-

حسن شاہ عبداللہ آفاق گیر　　کہ سارے شہاں ہیں سو توں ہی کبیر

توں ہیں گیان بتاہے عالی توں　　خدا نے دیا تجھ معانی تفضل

خدامت منجہ ہدایت ہوا — بڑی فکر سوں میں مرتب کیا

البتہ اس دکنی ابوشحمہ کی تصنیف سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۹۰ ہجری ہے، جو ذیل کے اشعار سے واضح ہے اور اس زمانہ میں تانا شاہ حکمران تھا۔

برس یک ہزار ہور نود سال میں — رجب کی ستادیس نہ بن رات میں

کر توفیق خدا نے منجے جب دیا — تداں یو قصا میں مرتب کیا

(۱۰) مثنوی پھول بن، ذنمبر ۱۰۳ صفحہ ۵۵۔ اس کی تفصیل میں جو شعر صفحہ ۵۵ کے آخر درج ہوا ہے، وہ غلط ہے، دراصل "تیس پر چار" ہونا چاہیئے۔ نہ کہ "تین پر چار"۔

مگر سب سے بڑی فروگذاشت جو اس مخطوطے کے متعلق ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ابن نشاطی کے اصل قصہ کا اضافہ جو قلعہ داران سدھوٹ کے زمانہ میں محمد حیدر جعفر نے کیا ہے، اس کی صراحت کیٹلاگ میں نہیں ہے، حالانکہ اس کی وضاحت نہایت ضروری تھی۔

محمد حیدر ابن جعفر قلعہ دار سدھوٹ نواب عبدالحمید خان کے دربار کا شاعر تھا، ان کے عہد میں عبدالکریم کے ایما سے (۳۰۰) سے زیادہ شعر اس نے

اضافہ کیے ہیں جس میں سنمبر کے شادی کے حالات مذکور ہیں، چنانچہ اس کی تائید
ذیل کے اشعار سے ہوسکتی ہے۔

تو عبد الحمید ہے نام اس کا ۔۔۔ عدل انصاف ہے جو کام اس کا

. . . .

کریم صاحب اہے اس نیک کا نام ۔۔۔ اہے جیون نام ان کا نیک نام
کریم ان کو دیا ہے نام بھی نیک ۔۔۔ دیا ہے اس موافق کام بھی نیک
اچھے قصیاں سے ان کو ادک ذوق ۔۔۔ کھانیاں سوں اچھی من آتے شوق
قصے کوں پھول بن کے دو سی جب ۔۔۔ بچارے یوں آپس دل انو تب
حکایت ہے سنمبر کی بھوت خوب ۔۔۔ سگل اس کا بیان ہے بہوت مجبوب
ولی نہیں بھاؤ کا مذکور ہے کچ ۔۔۔ نہ ہلدی تیل کا دستور ہے کچ
کچ یک شمہ سخن کا مج منی پائی ۔۔۔ سوں یوں اس بھاؤ کا مج حکم فرمائی

. . . .

کرے جب حکم سوں یوں مج سرفراز ۔۔۔ حکم پر میں کیا گنج سخن باز

محمد حیدر خود کو ابن جعفر سے مخاطب کرتا ہے، چنانچہ کہتا ہے :-

ختم کر ابن جعفر گوش توں دھر ۔۔۔ انا ابن نشاطی کے بچن پر

محمد حیدر کا اضافہ ابن نشاطی کے ذیل کے شعر کے بعد ہوا ہے :۔

عدالت کا رکہ اپنی سیس پر تاج ۔ فراغت سوں سدا کرتا رہا راج

یہ اضافہ شدہ اشعار ہندوستان کے کسی نسخہ میں میری نظر سے نہیں گذرے اور خود انڈیا آفس کے دوسرے نسخہ (نمبر ۱۲۲ صفحہ ۹۴) جو ۱۱۳۴ھ میں لکھا گیا ہے، موجود نہیں ہیں، علاوہ ازیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخہ میں بھی یہ عدم موجود ہیں، انڈیا آفس والا نسخہ بہت ممکن ہے کہ قلعداران سدھوٹ کا اصلی نسخہ ہو، یہ نسخہ میسور کی فتح کے بعد یہاں آیا ہے، مخطوطے کا مطالعہ وغیرہ اس کی تائید بھی کرتا ہے۔

افسوس ہے کہ ابن نشاطی کے حالات بھی گوشۂ گمنامی میں ہیں، اسپرنگر اور ڈی ٹاسی وغیرہ نے بھی اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

ابن نشاطی بھی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا باکمال شاعر ہے اس کے تفصیلی حالات گوشۂ گمنامی میں ہیں۔

(۱۱) قصہ چندر بدن و مہیار (نمبر ۱۰۰ صفحہ ۵۳) اس کے مصنف کا نام عزیز بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ عزیز کی تصنیف نہیں۔ بلکہ مقیمی کی تصنیف ہے اور خود مصنف نے متعدد جگہ اپنے تخلص کو ظاہر کیا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو :۔

مقیمی بچن کا نرنک سار توں بسر کر چلیا کان توں مہیار کون

شرح ست مقیمی پرت مہیار کا قصہ کرتوں پورا مہیار کا

دنیا تو فنا ہے مقیمی سہی رہے گی بچن کی نشانی رہی

علاوہ ازیں ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی اس کو مقیمی کی تصنیف بتایا ہے (ص ۶۲۵)

قصہ کی جو صراحت کیٹلاگ میں ہوئی ہے، وہ بھی نظر ثانی کی محتاج ہے

در اصل قصہ اس طرح نہیں ہے جیسا کہ کیٹلاگ میں مذکور ہے۔

مقیمی عادل شاہی شاعر ہے جو محمد عادل شاہ کے دور میں تھا۔

(۲) منطق الطیر (نمبر ۱۲۱ صفحہ ۶۳) اس کے مصنف کا نام بھی غلط ظاہر کیا گیا ہے

یہ وجدی کی تصنیف ہے جن کا نام وجہ الدین تھا، ان کی تین مثنویاں مشہور

ہیں۔

(۱) تحفۂ عاشقان جس کی تصنیف ۱۱۵۰ھ میں ہوئی ہے۔

(۲) منطق الطیر جس کا نام پنچھی باچھا بھی ہے، یہ ۱۱۳۱ھ میں مرتب ہوئی ہے،

(۳) مثنوی باغ جان فزا جو ۱۱۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے

منطق الطیر شیخ فرید الدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ یہ بمبئی میں طبع ہوا ہے۔

کتاب کے نام اور وجدی کے ثبوت میں ذیل کے اشعار دیکھو:۔

ناٹوں اس کا میں پنچھی باجا کیا　　　یادگاری خلق عالم پر رکھا

یوں دعا مانگی ہے گرچہ شیخ اپس　　　بخش وجدی کون بھی اے فریادرس

بیتے خلاصی منجکوں بھی دوزخ کی ہوئی　　　اسرار وجدی کون نہیں تجھ باج کوئی

(۱۳) پدماوت (نمبر ۳۷ صفحہ ۳۶) اس مخطوطے کے ضمن میں بہت کچھ صراحت کی جاسکتی تھی۔ جو وضاحت مخطوطے نمبر (۶۹ صفحہ ۸۶) میں کی گئی ہے۔ اس میں اس کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔

علاوہ ازیں چند دیگر فارسی اور دکھنی مخطوطوں کا ذکر ضروری تھا، لہٰذا ان کی پوری صراحت کی جاتی ہے۔

پدماوت کے قصہ کو اواخر ۹۴۷ھ میں ملک محمد جائسی نے شیر شاہ سوری کے حکم سے "بھاکا" میں مرتب کیا تھا، اس کے بعد مختلف شاعروں نے اس کو

فارسی نظم میں منتقل کیا چنانچہ اس کی صراحت درج ذیل ہے۔

ا۔ شیخ محمد بزمی نے ۱۰۲۸ھ میں بعہد جہانگیر بنام "پدماوت" مرتب کیا۔ یہ نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔

ب۔ عاقل خاں رازی نے ۱۰۶۹ھ میں بنام "شمع و پروانہ" اس کو نظم کیا۔ یہ بھی انڈیا آفس میں موجود ہے۔

ج۔ ۱۰۷۱ھ میں حسام الدین نے بنام حسن وعشق اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔ یہ برلن میں ہے۔

ان نظموں کے علاوہ لچھمی رام متوطن ابراہیم آباد نے قصہ فرح بخش کے نام سے رازی کے شمع پروانہ کو فارسی نثر میں مرتب کیا، یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر $\frac{818}{ADD}$ پر موجود ہے، دکھنی زبان میں اس کو دو شاعروں نے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔

ا۔ زیر بحث مخطوطہ جس کو غلام علی نے سلطان ابوالحسن تاناشاہ قطب شاہی دور کے آخر فرمانروا کے عہد میں بنام پدماوت مرتب کیا ہے اس مخطوطے میں بادشاہ کی مدح بھی درج ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

یو بعد از کردں میں ثنا چار یار کا　　　شہی بوالحسن اولیا جاہ کا

کتک شاہ اس کا عدالت دکھیت　　　ہوئے ظلم سٹ دیکھ عادل نپٹ

سخاوت میں مشہور جوں آفتاب — مگر حق او ناریلا ہے اوسکی باب
ہر یک علم میں ہور بلاغت منی — نہیں کوئی ہم تا شجاعت منی
سزاوار اچھو اس کی جم یو راج — مبارک اچھو سلطنت تخت و تاج

یہ کتاب کتب خانہ ٹیپو سلطان میں موجود تھی۔ جیسا کہ کیٹلاک مرتبہ اسٹوارٹ کے نمبر XII سے واضح ہے۔

انڈیا آفس کا یہ نسخہ نامکمل ہے۔ یورپ کے دیگر کتب خانوں میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے :-

ب - اس قصہ کو ولی دیلوری نے بنام "قصہ رتن و پدم" منظوم کیا تھا اور یہ کتب خانہ شاہان اودھ میں موجود تھا۔ جیسا کہ اسپرنگر نے صراحت کی ہے (ص ۶۴۱)

"شمع پروانہ" "رازی" "پدماوت" "بزمی" "فرح بخش" "لچھمی رام" "ملل شمع و پروانہ" عبرت اور پدماوت غلام علی کا میں نے مقابلہ کیا، ہر ایک کے قصہ کی صراحت میں کمی و بیشی پائی جاتی ہے، اس کی پوری صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، اس کی صراحت میں انشاء اللہ اپنی تالیف میں کروں گا۔

اسٹوارٹ اور اسپرنگر دونوں نے مصنفین کے متعلق کوئی وضاحت نہیں

عہد میں بھی موجود تھے، ان کی ایک دوسری تصنیف "ہدایت نامہ" ہے جس میں انہوں نے اپنے نام کی صراحت کی ہے اور عالمگیر کی مدح کی ہے۔ ہدایت نامہ سنہ ۱۱۰۰ھ میں لکھا گیا ہے —————— (از رسالہ تجلی جلد ۲ نمبر ۳)

(۱۶) "ظفر نامہ" (نمبر ۱۰۹ صفحہ ۵۸) اس کے متعلق جو فروگذاشت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ کٹیلاگ سے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ مثنوی سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے، حالانکہ خود مصنف نے اس کی صراحت کی ہے، چونکہ دیگر مثنویوں میں اس کی صراحت کی گئی، لہذا اس کے متعلق بھی ضروری تھا۔ خصوصاً جب کہ مصنف کو اس امر کا دعوے ہے کہ ان کی تصنیف "شاہ نامہ" فردوسی سے ممتاز ہے۔ خاتمہ کے اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

مرتب کیا ہور کہاں سو بیاں	کہ فی الجملہ کر بوتا ہوں عیاں
شہر حیدرآباد ان کا وطن	تھا جب دور سلطان شہ بوالحسن
مرتب سکے لک سوناچپ رہا	کیا تب ظفر نامہ کا میں بنا
ظفر نامہ کا تب ظہور ا ہوا	محرم کا جب بدر پورا ہوا

. . . .

شجاع ہور سخی ہور بڑی تور کا	ہوں سلطان عبداللہ کے دور کا

تاریخ تصنیف بھی خود انھوں نے بیان کردی ہے۔

سنہ یک ہزار و نود پانچ پر ا   بنا کر مرتب کیا یو اجھے

(۱۷) قصیدۂ بردہ (نمبر ۲۲ صفحہ ۱۴) اس کتاب کے ضمن میں بتایا جا سکتا تھا۔ کہ کہاں اور کب مرتب ہوئی، خود کتاب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بادشاہ عبداللہ کے عہد میں مرتب ہوئی ہے یہ اور ان کا خاندان نواب عبدالنبی خاں، عبدالحمید خان عبدالکریم خان وغیرہ سدھوٹ کے قلعہ دار تھے، مگر ان کی حالت خود مختاری کی سی تھی۔ یہ بڑے علم دوست تھے۔ ان کے زمانہ میں دکھنی زبان میں متعدد تصنیفات ہوئیں۔ ولی ویلوری اسی خاندان کے دربار سے متعلق تھا جس نے روضۃ الشہدا اور رتن و پدم تصنیف کیں، محمد حیدر نے ان ہی کے زمانہ میں ابن نشاطی کے پھول بن کا اضافہ کیا جس کا ذکر گذر چکا اور قصیدہ بردہ کا ترجمہ ہوا۔ بہر حال قلعہ داران سدھوٹ کے زمانہ میں علم و فن کی خاصی ترقی ہوئی ہے۔

(۱۸) دوازدہ مجلس (نمبر ۵۴ صفحہ ۲۷) اس کے دکھنی میں ہونے کی صراحت کیٹلاگ میں نہیں ہے اور نیز مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے:۔

یہ بھی دکھنی زبان میں ہے اور اس کا مصنف "عطا" ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

طرح کہ کیٹلاگ میں درج ہوتے ہیں۔

(۲۴) بکٹ کہانی (نمبر ۱۶۹ صفحہ ۸۸) یہ مخطوطہ پنجابی زبان میں ہے جیسا کہ مولف پنجاب میں اردو نے تفصیل سے صراحت کی ہے۔ علاوہ ازیں مخطوطے نمبر (۳۲ ۹ صفحہ ۱۴۸) کے اشعار سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ محمد افضل گوپال پنجابی تھا۔

چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

بکٹ افسانہ کا ہے یہ لو بھٹیا — دونوں کی تان جا ہے دی میا

اس افضل کہ جس کا نام گوپال — کہ تھا وہ نار لولی صاحب حال

P.77A

(۲۵) بوجہ زنجن (نمبر ۴ صفحہ ۲) کیٹلاگ میں اس کو بھی "دکھنی" ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ طرز عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دکھنی نہیں۔ بلکہ شمالی ہند کی ہے،

۲۶۔ ایک عام فروگذاشت کیٹلاگ میں یہ ہوئی ہے کہ فنون کے لحاظ سے جو تقسیم کی گئی ہے، اس پر پوری توجہ نہیں کی گئی ہے، مثلاً خاور نامہ جو تاریخ نہیں ہے تاریخ میں رکھا گیا ہے اور فتح نامہ ٹیپو سلطان (۱۲۵) جو منظومات میں رکھی گئی ہے تاریخ ہے قصص کا عنوان علیحدہ رکھا گیا ہے اور منظومات کا علیحدہ چند منظوم افسانے مثلاً (۲۱-۲۰-۲۲-۲۳-۲۴-۲۷) قصص کے تحت رکھے گئے ہیں اور چند مثلاً

(۹۹ - ۱۰۰ - ۱۰۳ - ۱۰۴ - ۱۰۸ - ۱۰۹ - ۱۱۰) وغیرہ منظومات کے تحت، اس طرح بعض مذہبی نظموں کو منظومات کے تحت درج کیا گیا ہے اور بعض کو دینیات کے تحت مثلاً (۲-۳-۴) یہ کل صراحت صرف ان مخطوطوں کی بے جوڑ کہنی ہونے کے باعث میں نے دیکھے ہیں اس طرح ممکن ہے اور بھی فروگذاشتیں ہوئی ہوں[1]۔

(معارف ۱۹۲۹ء)

اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ کی چند

قابل توجہ فروگذاشتیں

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی جانب سے "اردو زبان اور ادب" کے نام سے ایک رسالہ گذشتہ سال شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ ہے جس کو کمیٹی مذکور کے صدر سید ضامن علی صاحب ایم۔ اے صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے مرتب فرمایا ہے۔

یہ رپورٹ بعض مخصوص وجوہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اول تو یہ کہ ہندوستان کے عظیم الشان طول وعرض میں اردو زبان کی تنہا یہی ایک اکیڈیمی ہے، دوسرے یہ کہ اردو کی ترقی کے لئے گویا یہ ایک دستور العمل ہے جس پر

---

[1] اس تنقید کے بعد اصلی کیٹلاگ میں تصحیح بھی کرا دی گئی ہے۔

نہ صرف ممبران اکیڈیمی بلکہ تمام ہمدردان اردو عمل کریں گے۔ اس لئے اس رپورٹ میں کسی قسم کی غلطی یا فروگذاست کا ہونا نامناسب ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر چند امور کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جو میری تحقیقات کے لحاظ سے صحت طلب ہیں (۱) صفحہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے۔

"دکن میں اردو نہ محض پورے طور پر بولی جاتی تھی۔ بلکہ رفتہ رفتہ ادبی زبان ہو گئی تھی اور ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ فارسی اور ریختہ کا زبردست شاعر تھا"

اس صراحت سے عام طور پر یہ سمجھا جائیگا۔ کہ اردو زبان دکن میں ریختہ کے نام سے موسوم تھی۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں ولی اورنگ آبادی کے پہلے کسی نے بھی اس لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں اردو کو عام طور سے دکھنی یا ہندی سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ خاور نامہ میں کمال خاں رستمی کہتا ہے۔

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر۔ بولیا معجزہ یو کمال خاں دبیر

مثنوی پھول بن میں ابن نشاطی کہتا ہے:۔

اسے ہر کس کے تئیں سمجھا کون توں بول   دکھنی کے باتاں ساریاں کوں کھول

گلشن عشق میں نصرتی کہتا ہے :-

آ دیکھا ہو حد سوں کباب،   رکھی بول اتنا جو دکھنی کتاب

میراں یعقوب کہتے ہیں :-

"اپنی حیات کے وقت مجھے ارشاد کئے تھے۔ جون شمائل الاتقیا کون ہندی زبان میں لیا دے تا ہر کسی کو سمجھا دے۔"

ان عادل شاہی اور قطب شاہی نمونوں سے واضح ہو سکتا ہے۔ عام طور سے دکن میں اردو کو دکھنی یا ہندی کہا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد بھی جنوبی ہند میں اردو کو انہی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ مولانا باقر آگاہ متوفی سنہ ۱۲۲۰ھ اپنی تصنیف ریاض الجنان میں لکھتے ہیں :-

"بعضے علماء ان مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس باب میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ پس تصنیف ہونا اس کا ہندی زبان میں معلوم۔ مگر گلی ویلوری و رشید لئے حیدر آبادی دکھنی زبان میں "نسخے منظوم لکھے ہیں۔"

باقر آگاہ کی دیگر تصنیفات سے بھی ان ہی ناموں کا پتہ چلتا ہے :-

نہ تھا شان میرے کا یہ اقتضا ‏ ‏ ‏ کہ ہندی زباں کا کرے مصطفا

و لے بعض یاروں کا ایما ہوا ‏ ‏ ‏ سو ہندی زبان یہ رسالہ ہوا

(رسالہ فرقہ ہائے اسلام)

ہے دکھنی میں مجکو مہارت بتی ‏ ‏ ‏ کہ النفسر منکم کیے لفسر تی

کیا نظم دکھنی میں فائز اسے ‏ ‏ ‏ سخن میں نہ تھی راہ ہرگز اسے

(تقسیم رضوان شاہ)

آگاہ کے بعد قاضی بدرالدولہ متوفی ۱۲۸۰ھ نے بھی لفظ اردو یا ریختہ کا استعمال نہیں کیا، بلکہ ہندی سے موسوم کرتے ہیں :-

"لیکن دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے . . . . اور کسی کو خواہش مند بھی نہیں پایا، تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا

(فوائد بدریہ)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن میں دکھنی یا ہندی نام تھا ریختہ

کا نام کسی نے نہیں لکھا۔

دکن میں سب سے پہلے ولی اورنگ آبادی نے لفظ ریختہ کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے :۔

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو   رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

میرا خیال ہے کہ جس طرح جنوبی ہند میں اردو کا نام دکھنی رکھا گیا تھا۔ اسی طرح شمالی میں وہ پہلے پہل ریختہ سے موسوم ہوئی۔ ولی نے اس کا استعمال اپنے سفر دہلی کے بعد کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دکھنی شعرا کے قطع نظر شمالی ہند کے شعرا نے اس لفظ کا استعمال عام طور سے کیا ہے۔ میر کہتا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے   معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن تھا

قائم کہتا ہے :۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ   اک بات لچر سی بہ زبان دکھنی تھی

اثر کہتا ہے :۔

ریختہ نے یہ تب شرف پایا   جبکہ حضرت نے اس کو فرمایا

شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔
"درشعر فارسی پیروی مرزا صائب است در ریختہ ولی را استاد
میداند"

میرے خیال کی تائید مولانا باقر آگاہ کے رائے سے بھی ہوتی ہے۔
چنانچہ وہ اپنی مثنوی گلزار عشق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔
"ہندوستان (شمالی ہند) میں مدت تک زبان ہندی کہ اسے
برج بھاکا کہتے ہیں، رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان
کی اصل اصول اور مخرج فنون فروع و اصول ہے۔ پیچھے محاورہ
برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب
خاص اس کے کھونے لگے بسبب سے اس آمیزش کے یہ زبان
ریختہ سے مسمٰی ہوئی۔"
آگے چل کر اسی دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔
"مخفی نہ رہے۔ کہ تمام ریختہ گویوں میں سودا اعتبار نمایاں پایا

. . . . . بعضے اس قدر اس کے باب میں دفتر اغراق کا
لکھ دیتے ہیں کہ اس بیچارے کو سب شعرائے ریختہ کو بلکہ تمام ادبائے
فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں"۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے۔ شمالی ہند میں کس وقت سے ریختہ کا نام زبان
کے لئے استعمال ہوا؟

یہ فارسی لفظ ہے جس کے مختلف معنی لئے گئے ہیں۔ جن کے منجملہ ایک
یہ بھی ہے۔ کہ وہ کلام جو دو یا زیادہ زبانوں سے مخلوط ہو۔ جہاں تک پتہ چلتا
ہے اولاً امیر خسرو نے اس لفظ کو اردو میں موسیقی کی اصطلاح قرار دیا تھا۔
چنانچہ مولانا مخدوم علاؤالدین نے اپنے مرشد بہاء الدین کی سند پر امیر خسرو
کی خدمات موسیقی کے ذکر میں ریختہ کے متعلق بیان کیا ہے:۔

"در اصطلاح دیگر آں کہ ہر فارسی کہ بامضمون خیال ہندوی مطابق
الفاظ باشد الفاظ ہر دو زبان را در یک مال و یک را برابست نمودہ
باشند و انضمام و اتصال دادہ سرایند آں را ریختہ گویند"۔

معلوم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد شمالی ہند میں یہ لفظ جو موسیقی کی اصطلاح
قرار دیا گیا تھا۔ زبان کا نام ہو گیا۔ مگر جنوبی ہند میں عام طور سے وہ دکھنی

اور ہندی سے موسوم تھی نہ کہ ریختہ سے۔

اس پوری تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ دکن میں اردو زبان ریختہ کے نام سے نہیں پکاری جاتی تھی۔ دکن میں ریختہ صرف اس کلام کو کہتے تھے۔ جو بالکل فارسی آمیز ہوتا تھا۔

۲۔ صفحہ ۲۱ پر بیان کیا گیا ہے :۔

"دکن میں ریختہ کی شاعری کو روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ علاوہ نظم کے نثر کی جانب بھی بعض نے جہانگیر کے عہد حکومت میں توجہ کی اسی عہد میں شجاع الدین نوری ہاشم برہان پوری کاظم علی رام راؤ اور سیوا نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ غواصی نے طوطی نامہ نخشبی کا ترجمہ کیا۔ جس کا ایک مصرعہ ریختہ میں اور ایک فارسی میں ہے۔"

اس تحریر میں کئی ایک امور صحت طلب ہیں :۔

ا۔ شجاع الدین نوری کے مرثیوں کے اڈنبرا میں ہونے کا فٹ نوٹ دیا گیا ہے۔ یہ بیان نصیر حسین خان صاحب خیال کے مضمون سے اخذ کیا گیا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اڈنبرا یونیورسٹی کے مرثیوں میں شجاع الدین نوری کا ایک بھی مرثیہ نہیں ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ

"غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است
بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریکٹ کہانی"۔ (ص ۱۴۲)

حقیقت یہ ہے یہ بیان اصلیت سے بہت دور اور خلاف واقعہ ہے۔ طوطی نامہ
غواصی کو دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بیان کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے
میرا خیال ہے، مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے معتمد انجمن ترقی اردو نے
کسی مضمون کے ضمن میں میر حسن کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ طوطی ناموں کے
متعلق ہم نے تفصیل کے ساتھ ایک مضمون قلمبند کیا ہے۔ جو نیرنگ خیال (جو
(جولائی سنہ ۲۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ بطور ثبوت طوطی نامہ غواصی کے چند شعر
درج کئے جاتے ہیں:۔

رتن خاص دریائے لولاک کا — جھلک لامکان نور افلاک کا
محمد نبی سید المرسلیں — سدا روشن اُستے دنیا ہور دیں

جن اس جواہر لاں کے سمندر کا گہیر — ہے غواص اس دور میں بے نظیر
سو یو جواہراں کا رلیا نا ہے ہار — جو ملک ہندوستان میں ایک ٹھار

نمبر شمار	نام کتاب معہ صراحت صفحہ	صراحت غلطی	صحت
۳	قصہ جنیا ربدن صفحہ ۶۰	یہ عزیزی کی تصنیف ہے	دراصل مقیمی کی تصنیف ہے۔ نہ کہ عزیزی کی
۴	طوطی نامہ غواصی	سے ملنے کا پتہ غلط ہے	جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے پیرس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ بلکہ برٹش میوزیم میں دو نسخے ہیں۔
۵	خاور نامہ	کمال خاں کا تخلص رسمی غلط ہے۔	دراصل رستمی تخلص ہے۔
۶	علی نامہ صفحہ ۶۲	عماد الملک کے کتب خانہ کا وجود نہیں ہے اس لئے ملنے کا پتہ درست نہیں ہے	انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے علاوہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے، دفتر دیوانی حیدرآباد میں ہی موجود ہے۔
۷	مثنوی پھول بن صفحہ ۶۲	تاریخ تصنیف غلط ہے	صحیح سنہ ۱۰۶۶ھ ہے۔
۸	مراثی منشی شجاع الدین نوری صفحہ ۶۳	سے ملنے کا پتہ	اڈنبرا میں کوئی مرثیہ ان کا نہیں ہے
۹	مثنوی یوسف زلیخا ہاشمی	سے ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے

شمار	نام کتاب معہ نمبر صفحہ	صراحت غلطی	صحت
۱۰	قصہ فیروز شاہ صفحہ ۶۶	اس کا وجود ہی غلط ہے	کوئی کتاب اس نام کی نہیں ہے ۔
۱۲	مثنوی من لگن صفحہ ۶۶	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں البتہ سرامیں جنگ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ ہے اور ہمارے خاندان میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے ۔
۱۳	قصہ زن دیدم صفحہ ۶۶	سنہ تصنیف اور ملنے کا پتہ غلط درج کیا گیا ہے	صحیح سنہ تصنیف غیر معلوم ہے انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے ۔
۱۴	روضۃ الشہدا صفحہ ۶۶	سنہ تصنیف غلط ہے اور ملنے کا پتہ درج نہیں	صحیح سنہ تصنیف ۱۱۳۰ھ ہے انڈیا آفس کے علاوہ میرے پاس بھی اس کا ایک نسخہ ہے
۱۵	پنچھی باچھا صفحہ ۶۸	مصنف کا نام اور سنہ تصنیف غلط ہے	وجدی کی تصنیف ہے ۱۱۵۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے ۔
۱۶	قانون اسلام صفحہ ۶۴	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں کوئی کتاب نہیں ہے ۔
۱۷	مراثی مرزا صفحہ ۶۴	ملنے کے پتہ کی صراحت نہیں ہے	اڈنبرا یونیورسٹی کے بیاض میں اس کے مرثیے موجود ہیں ۔
۱۸	سب رس صفحہ ۶۰	ملنے کا پتہ نہیں ہے	کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے ۔

شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تصنیف	ملنے کا پتہ
۳	پدماوت	غلام علی	سنہ ۱۰۹۱ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۴	قصہ حسنی	خواص علی	سنہ ۱۰۹۰ھ	" "
۵	قصہ بہرام و حسن بانو	امین دولت	سنہ ۱۰۵۰ھ	برٹش میوزیم
۶	ہشت بہشت	ملک خوشنود	سنہ ۱۰۵۶ھ	" "
۷	عشق صادق	ضعیفی	سنہ ۱۱۰۰ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۸	جنگ نامہ حیدر	اشرف	سنہ ۱۱۲۵ھ	برٹش میوزیم
۹	غوث نامہ	ذوقی	سنہ ۱۱۰۹ھ	" "
۱۰	دیوان حسینی (مراثی ہاشم علی)	ہاشم علی	سنہ ۱۱۶۹ھ	اڈنبرا یونیورسٹی
۱۱۲	شوہر نامہ	صابر	سنہ ۱۱۵۶ھ	برٹش میوزیم
۳	سوداگر کی بی بی	؟	سنہ ۱۱۶۴ھ	" "
۱۴	عقد فاطمہ	مخدوم حسینی	سنہ ۱۱۶۴ھ	انڈیا آفس
۱۵	معجزات رسالت	"		" "
۱۶	دیوان عاجز	عارف الدین عاجز	"	قومی کتب خانہ پیرس
۱۷	اسلام عمر	عبداللہ مکنہ	سنہ ۱۱۷۰ھ	کتب خانہ انڈیا آفس

شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تصنیف	ملنے کا پتہ
۱۸	روضۃ الصالحین	غلام حسین	۱۲۰۸ھ	برٹش میوزیم
۱۹	جنگ بھاؤ مرہٹہ و شاہ درانی	؟	۱۲۰۰ھ	انڈیا آفس
۲۰	دیوان چندا	مہ لقا بائی چندا	۱۲۱۳ھ	" "
۲۱	دیوان شاداں	چندو لعل	۱۲۵۰ھ	" "

مزید فہرست بخوف طوالت نظر انداز کی جاتی ہے، بہرحال اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ زیر بحث فہرست نامکمل اور ناقص ہے۔ نواب سالار جنگ بہادر (حیدر آباد) کے کتب خانہ میں بھی کئی سو مخطوطات محفوظ ہیں۔ امید ہے کہ اکیڈیمی اس پر غور کرے گی۔

(جامعہ دہلی ۱۹۳۲ء)

تاریخ نثر اردو پر ایک نظر

گذشتہ چند سالوں میں زبان اردو کے متعلق گل رعنا، دکن میں اردو، اردوئے قدیم، شعر الہند، سیر المصنفین، پنجاب میں اردو، تاریخ ادب اردو، اردو زبان اور ادب اور اردو شہ پارے وغیرہ متعدد محققانہ کتابیں

لکھی گئی ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے، اور ہنوز اس امر کی گنجائش ہے کہ اور نئی کتابیں اس موضوع پر مرتب ہوں، کہ علم ادب ریاضی نہیں جس کا ہر مسئلہ یقینی اور قطعی ہو اور نہ کوئی شخص دعوے کر سکتا ہے کہ اب مزید تحقیق اور اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اسی لئے اب محققین اردو ادھر متوجہ ہیں، اور آئے دن نئی نئی کتابیں اس عنوان پر لکھی جا رہی ہیں۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں ابھی حال میں تاریخ نثر اردو شائع ہوئی ہے، اس کے مولف ہندوستان کے مشہور ادیب و شاعر جناب احسن مارہروی ہیں جن کے ادبی کارناموں سے اہل ملک بخوبی واقف ہیں، ابھی چند سال پہلے داغؔ دہلی کا کلیات مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔

زیر بحث تاریخ کے مضامین کا خلاصہ حسب ذیل ہو سکتا ہے :-

اولاً (۳۸) صفحوں میں مقدمہ ہے جس میں یہ بحث ہے کہ اردو کی ابتدا نظم سے ہوئی یا نثر سے؟ آغاز لفظ اردو کی تحقیق اور زبان اردو کی خصوصیات اردو الفاظ کی بنیادیں، شمالی ہند میں اردو کیوں دیر میں مروج ہوئی؟ اردو زبان کا عام اثر، اس کی باقاعدہ تدوین، اس کے متعدد نام، دیوان کی ترتیب،

نثر اردو کی تصنیف کا آغاز، موجودہ اردو کی ابتدا، آسان اور قابلِ تقلید اردو وغیرہ عنوان پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جس کے چھ دور سنہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) سے سنہ ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) تک قائم کیے گئے ہیں۔

پہلا دور	سنہ ۸۰۱ھ سے سنہ ۹۰۰ھ تک	۳ صفحوں میں
دوسرا دور	سنہ ۹۰۱ھ سے سنہ ۱۰۰۰ھ تک	۲ صفحوں میں
تیسرا دور	سنہ ۱۰۰۱ھ سے سنہ ۱۱۰۰ھ تک	(۱۲) صفحوں میں
چوتھا دور	سنہ ۱۱۰۱ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک	۱۹ صفحوں میں
پانچواں دور	سنہ ۱۲۰۱ھ سے سنہ ۱۳۰۰ھ تک	۱۰۸ صفحوں میں
چھٹا دور	سنہ ۱۳۰۱ھ سے سنہ ۱۳۴۸ھ تک	۴۲۶ صفحوں میں آیا ہے

پہلے دور میں، ایک نثر کا نمونہ اور اس پر تبصرہ و کیفیت اور الفاظ قدیم و جدید دیئے گئے ہیں۔

دوسرے دور میں، دو نثروں کے نمونے ان پر تبصرہ و کیفیت اور الفاظ قدیم و جدید۔

تیسرے دور میں، چار نثروں کے نمونے ان پر تبصرہ و کیفیت، اور الفاظ قدیم و جدید۔

چوتھے دور میں، چار نثروں کے نمونے ان پر تبصرہ و کیفیت، اور الفاظ قدیم و جدید۔

پانچواں اور چھٹا دور زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے، اس میں بھی خصوصاً چھٹے دور میں جو ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۴۸ھ تک ہے، نہایت تفصیل کو کام میں لایا گیا ہے اور ہر قسم کی نثروں کے نمونے مثلاً کتابی، قانونی، اخباری، اشتہاری، بازاری بول چال کے نمونے اور خطوط کے نمونے شامل ہیں، جا بجا ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ہر نمونۂ عبارت کے ساتھ امورِ ذیل کی خانہ پری کی گئی ہے :-

(۱) نام تصنیف، (۲) نام مصنف (۳) سنہ تصنیف

بادی النظر میں کتاب کا بڑا حصہ صرف عبارت کے نمونوں پر مشتمل ہے، جو ممکن ہے کہ بقول بعض "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" کا مصداق ہو، مگر جن کو اس قسم کے کاموں کا تھوڑا سا بھی تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کا جمع کرنا، ترتیب دینا، ان پر تبصرہ کرنا اور کیفیت لکھنا، کوئی معمولی کام نہیں ہے اس کے لئے برسوں کی محنت سالہا سال کی کاوش اور عرق ریزی درکار ہے۔

اردو کا میدان نہایت وسیع ہے، اس کی ہمہ گیری اور عالمگیری کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی تاریخ پر قلم اٹھانا معمولی کام نہیں، کیونکہ ہندوستان کے

برصغیر ملک کے اردو کے خدمات سے پوری طرح واقف ہونا کوئی آسان بات نہیں
ہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں کا میدان ہی کافی وسیع جولانگاہ ہے،
جس میں محققین اردو دادِ تحقیق دے سکتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے۔ کہ ایک
دکنی ہرگز پنجاب کے کارناموں سے کما حقہٗ واقف نہیں ہو سکتا، اور اسی
طرح پنجابی دکن کے کارناموں سے، علیٰ ہذا گجراتی، بہاری، شمالی ہندی وغیرہ جو
اصحاب اس کی ہمہ گیری پر قلم اٹھاتے ہیں، وہ واقعی بہت بڑا کارنامہ اپنی
یادگار چھوڑتے ہیں۔

گل رعنا، اردوئے قدیم، شعر الہند، سیر المصنفین، تاریخ ادب اردو اور
اردو شہ پارے اسی قسم کی کتابیں ہیں، اگرچہ ہر ایک اپنے مضمون کے لحاظ
سے دلچسپ اور تحقیق کے ساتھ مرتب ہوئی ہے۔ مگر مندرجہ بالا اصول کے لحاظ
سے ان کو دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا، ان میں اکثر صرف شمالی ہند کے لیے
مختص ہیں، حالانکہ اردو کی تاریخ میں جنوبی ہند کا خاص حصہ ہے، اس کو نظر انداز
کر کے اردو کی تاریخ ہرگز مکمل نہیں ہو سکتی۔

جناب حسن مارہروی شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انہوں نے جس مضمون پر قلم اٹھایا
ہے، اس کو بلا تعصب تحقیق کے ساتھ اور بڑی حد تک مکمل طور پر لکھا ہے، تاہم زبان

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

رسالے ارکاٹ نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے، جس پر ہم تفصیل سے مضمون لکھ رہے ہیں، نظم کے قطع نظر یہاں بعض ان کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جو نثر میں لکھی گئی ہیں اور مشہور و معروف ہیں۔

۱۔ "ترجمہ آدم فی الحدیث" اس نام سے ایک کتاب شیخ آدم نے عمدۃ الامرا (۱۲۰۶ تا ۱۲۱۶) کے زمانہ حکمرانی میں مرتب کی ہے، دراصل یہ "زواجر" کا ترجمہ ہے، اس کی تصنیف عمدۃ الامرا کے فرزند معین الدولہ محمد علی حسین خان کے حکم سے ہوئی ہے، عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"بعدہٗ جان تو ن جو مردمک دیدہ دولت و اقبال نور البصر جاہ و جلال امیر کبیر در امارت بی نظیر نواب امیر الملک معین الدولہ محمد علی حسین خان بہادر ظفر جنگ یعنی ثمرہ نواد قرت العین معین شاہان بادای سلطنت پناہان جناب امیر الہند والاجاہ نواب عمدۃ الامرا بہادر . . . .

. . . . صفحہ ۲

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تفسیر میں ہے۔ کہ ویل دوزخ میں ایک وادی ہے، وادی گہرے کو کہتے ہیں، اس وادی سے تمام دوزخیاں اور دوزخ ہر ایک روز سات دفعہ پناہ مانگتی ہیں ص۹

ب۔ قصص انبیا' اس کے مصنف عبدالصمد ابن عبدالوہاب خان نصرت جنگ ہیں، نصرت جنگ والاجاہ محمد علی خاں کے بھائی ہیں، اس کی تصنیف ۱۲۱۸ھ میں ہوئی ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انبیا کے قصوں پر مشتمل ہے، فارسی سے اس کو ترجمہ کیا گیا ہے، عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

"اور میرا نام عبدالصمد عبدالوہاب خاں بہادر نصرت جنگ کا فرزند ہوں، عالم کون فائدہ ہونے کے واسطے قصص الانبیا کون دکھنی زبان میں نثر بنایا ہوں . . . .

یکروز حضرت یعقوب علیہ السلام کی حال کہے۔ کہ توں یہاں اپنے جان کے خوف سین رہتا ہے، رات کے وقت نکلتا ہے، توں میرے سات شام کے ملک کو چل وہاں میری بہن کی لڑکی سے تیری شادی کر دیتی ہوں، جب یعقوب علیہ السلام اورانو کی مال دو چل کر چلے تب انوکی ماں یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل رکھے"۔

ج۔ تصنیفات مولانا قاضی بدرالدولہ مغفور

قاضی صاحب نے جنوبی ہند میں بڑا کام کیا ہے، آپ کے اردو تصنیفات

موجودہ زمانہ کے اخبار کا سہرا یورپ کے سر ہے، جب مدراس میں یورپ کی ایک متمدن سلطنت کا قیام ہوا۔ تو یہاں بھی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے انگریزی اخبارات کی تقلید میں سب سے پہلے مدراس ہی سے اردو کا پہلا اخبار عمدۃ الاخبار جاری ہوا۔

والاجاہ کے جانشین عمدۃ الامرا تھے جنہوں نے ۱۲۰۶ھ سے ۱۲۱۶ھ تک ارکاٹ کے مسند حکومت پر فرمانروائی کی، آپ کے زمانہ حکومت میں آپ ہی کی سرپرستی میں آپ کے نام سے عمدۃ الاخبار کا اجرا عمل میں آیا اور اس کے بعد اسی کی تقلید میں احسن الاخبار، جامع الاخبار، منظر الاخبار وغیرہ جاری ہوئے۔ افسوس ہے کہ سر دست منظر الاخبار کے سوا کسی پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

منظر الاخبار ایک ہفتہ وار اخبار تھا جو ۱۲۷۲ھ میں محلہ ترلمکھری مدراس سے شائع ہونے لگا تھا۔ اور ایک عرصہ تک اس کے جاری رہنے کا پتہ چلتا ہے یہ بارہ صفحے کا اخبار تھا، اس میں غیر ملکی خبریں شہری خبریں اشتہارات وغیرہ شائع ہوتے تھے، اس کے ایڈیٹر محمد خواجہ بادشاہ متخلص عبرت تھے۔

ہمارے پیش نظر اس وقت اس کی ساتویں جلد کا تیئیسواں پرچہ ہے، عبارت کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے کیسی صاف اور سلیس اردو ہے مختلف مقامات سے

اس کے عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

"مصر، اخبارات ولایت مظہر ہے کہ سلطان روم معہ پاشا مصر کو جائیں گے اور چالیس روز میں بازگشت فرمائیں گے۔

(یونان) آج تک یہ تخت بے چراغ تھا، شکر ہے کہ اب روشن ہوا جناب ولیعہد ملکہ محتشمہ کے سالے ولیم صاحب بہادر اس تخت پر رونق افروز ہوئے"۔ ص۱۱

"ضیافت سرا لطافت عقد تزویج ہندوستان کے اہل اسلام میں دو قسم پر رواج پایا ہے، ایک نکاح خوانی جو اصل دین ہے، یعنی فقط شروط و آداب نکاح موافق حکم شرع بجالانا، چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں جہاں سے دین اسلام پیدا ہوا، اور جمیع بلاد عرب و شام و ترک و مغرب وغیرہ میں اسی آئین پر ازدواج کا رواج شائع ہے دوسرا شادی جو مخصوص اختراع اہل ہند ہے، یعنی چند رسوم غیر شرعی مروجہ ہنود کے مسلمانوں نے فقط حظوظ نفسانی حاصل کرنے کے لئے سراسر رسم ہنود سے اخذ کرکے اور ان کو تراکیب تازہ دے کر نکاح کے ساتھ منضم کر دی ہیں . . . .

الحمد للہ والمنۃ زہے زبان سعادت توامان ہے عجب آور
عنوان ہے، نوید صلاح و فلاح ہر مکان ہے تا امند فرح متنا سند
مژدہ رساں ہے، لو آج کل معمورۂ مدراس میں یہ رواج ہے، رہ راست
پر ہر معاملے کا امتزاج ہے، ہر طرف طریق است نبوی کی گرم بازاری ہے
شرح رسولؐ و دین مصطفویؐ کی استواری ہے، . . . . . چنانچہ
عالم با عمل افضل و اکمل فضیلت منازل آگاہ دل واقف حقایق فروع
و اصول کاشف غوامض معقول و منقول برگزیدہ بارگاہ ایزدی قدوہ
مقربان حضرت صمدی سر دفتر علماء دیار و امصار فاضل و علامہ روزگار
جناب مستطاب حضرت قاضی الملک بہادر دام افضالہم و عم احسانہم نے
باوجود کمال قدرت و طاقت تامہ محض بلحاظ بہبودی اپنے متوسلین و
متعلقین کے کہ تا اس کے تبعیت و تقلید کریں۔ ۷ روین تاریخ ماہ ذیحجہ
روز جمعہ ۱۲۷۹ھ وقت ہفت ساعت عقد نکاح اپنے فرزند ارجمند
حافظ حسین عطاء اللہ صاحب کا دختر نیک اختر ماہ برج امارت و بختیاری
مہر سپہر کبیر جناب مستطاب معلی الالقاب حضرت سالار الملک بہادر دام
شوکتہم کے ساتھ "بلا تکلف باندھ دیا۔ فلک نے بارک اللہ کہا۔"

ؔ راقم الحروف کے نانا تھے۔

نمونہ اشتہارات :۔

"روغن ہالوے' اس روغن کو رکھنے والا شخص اپنے گھر کا طبیب ہو سکتا ہے' چونکہ اگر اس کو یا اس کے اطفال وغیرہ کو جلدی امراض مثلاً پھوڑے۔ دنبل۔ ناسور۔ ورم۔ دمہ اور دوسری شکایتیں ہوں تو روغن کے استعمال سے اپنے اور اپنے متعلقین کو درست کر سکتا ہے پروفیسر ہالوے نمبر (۲۴۴) اسٹرانڈ لنڈن ٹمپل بار کے متصل اور جمیع ذی عزت و مشہور پنساریوں کے دوکانوں میں قیمت ذیل کے بموجب بکتے ہیں' فی ڈبی ایک شلنگ یعنی آٹھ آنہ۔

اس عبارت سے واضح ہو سکتا ہے، ۱۲۶۲ھ میں کس طرح صاف اردو بولی جاتی تھی۔

اس کے بعد مدراس سے بیسیوں روزانہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوتے رہے ہیں' مثلاً شمس الاخبار۔ جریدۂ روزگار' نیر آصفی' مخبر دکن وغیرہ ان میں سے کسی کا ذکر اس تاریخ میں نہیں ہے، میرے ناقص خیال میں ایک اور بات بھی مؤلف کی توجہ کے قابل ہے۔

پانچویں اور چھٹے دور میں ہر قسم کے فنون کے متعلق نمونے دیئے گئے ہیں

مگر ان میں کوئی فصل یا حد بندی نہیں ہے، اس کے باعث ایک نمونہ عبارت مثلاً سنہ ۱۳۲۵ھ کے بعد دوسرا نمونہ سنہ ۱۳۱۱ھ کی عبارت کا دیا گیا ہے۔ بادی النظر میں دھوکہ ہوتا ہے۔ کہ سنہ ۱۳۲۵ھ کے بعد سنہ ۱۳۱۱ھ کا نمونہ کس طرح ہے۔ اس لئے اگر فنون کے لحاظ سے عنوان قائم کرکے حد بندی کر دی جاتی۔ تو مناسب ہوتا۔ (رسالہ معارف سنہ ۱۹۳۲ء)

سب رس کے مقدمہ پر ایک تنقیدی نظر

بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو نے قطب شاہی زمانہ کے ایک بلند مرتبہ ادیب اور شاعر ملا وجہی کی گرانقدر کتاب "سب رس" شائع کرکے اپنے سرمایہ مطبوعات میں اچھا اضافہ کیا۔ آٹھ سال کی طویل عرق ریزی اور جاں کاہی کے بعد تصحیح و مقدمہ نگاری کے مراتب طے کرکے بالآخر دکھنی نثر کا ایک گراں پایہ شاہکار شائقین ادب کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔

ہندوستان کے مایۂ ناز فرد مولانا عبد الحق صاحب مد فیوضہ نے زبان و ادب اردو کی خدمت گذاری کا جو حق ادا کیا ہے۔ وہ حق یہ ہے کہ زندگی جاوید

کا مستحق ہے۔ تاریخ و زبان و ادب میں مولانائے محترم کی سعی و کوشش اور اس کے بیش قیمت نتائج کا تذکرہ ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا جس کو نہ مخالف لغت مٹا سکے گی اور نہ زمانہ بھلا سکے گا۔

کتابوں کی مقدمہ نگاری میں مولانائے محترم کو جو خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ ایک امر مسلمہ بن گیا ہے۔ ابھی حال میں ان کے مختلف مقدمات دو ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر دنیائے ادب میں ایک مخصوص وقعت حاصل کر چکے ہیں۔

"سب رس" پر بھی مولانا نے ایک خاص طویل مقدمہ قلمبند فرمایا ہے۔ یہ بھی مولانا کے مخصوص طرز انشا کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مولانا کے ذوق تحقیق اور رواں اسلوب کی داد دینا دراصل آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

اس مقدمہ کو شروع سے آخر تک پڑھ کر ہم نے سب سے اول ایک سبق حاصل کیا وہ یہ کہ کسی کتاب یا کسی شے کے پرکھنے میں اس کے ہر پہلو کو دیکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی شے اچھی ہے۔ تو اس کے ساتھ اس کی برائیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے خطا و صواب ساتھ ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی پہلو کو قطعی ترجیح نہیں حاصل ہو سکتی۔ تاوقتیکہ دونوں کا پورا پورا موازنہ نہ ہو جائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اس مقدمہ پر بھی ہم نے ایک نظر ڈالی ہے۔ اگر اس میں کسی بات سے سوادب

کا شائبہ ظاہر ہوتا ہے۔ تو اس سے حاشا کسی طرح کی تنقیص کا کوئی ادنیٰ ارادہ بھی مرکوز خاطر نہیں ہے، ہمارا اعتقاد ہے کہ

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

یہ مقدمہ (۵۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے دو صفحات تمہید کے ہیں مقدمہ کی ابتدا یہ ہے۔ کہ :۔

"کچھ ہی دنوں پہلے تک ولی اردو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا تھا"۔

خدا جانے آزاد مرحوم نے کس گھڑی میں غریب دکنی کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ہر شخص جس نے کچھ بھی تحقیق کی داد دی اس کا مذاق اڑایا۔ یہ نکتہ تحقیق اس قدر دہرایا جا چکا ہے۔ کہ اس میں اب کچھ لطف نہیں رہا۔ اس وقت تک کی معلومات کے لحاظ سے بے شک ولی ہی باوا آدم تھا۔ اب بھی کوئی اس لکیر کو پیٹنا چاہیے۔ تو پیٹا کرے۔ اگر اس سے زیادہ اس میں کد و کاوش کی جائے۔ تو بھونڈا پن آجائے گا تمہید کا ایک صفحہ یوں ختم ہو گیا۔

بعد میں مولانائے محترم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ کہ :۔

"ہر زبان میں (زمانہ کے لحاظ سے) نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے"۔ پھر اسی

خیال کو پورے ایک صفحہ میں پھیلایا ہے۔ اول تو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔
کہ "سب رس" کے متعلق مقدمہ لکھنے میں یہ بحث پیش کی جاتی۔ دوسرے یہ
سارا بیان اپنے سباق و سیاق کے لحاظ سے کچھ بے ربط اور معلق سا ہے۔ اس
بحث سے پہلے مولانا نے "ولی" کو باوا آدم قرار دینے پر جن لوگوں کو اصرار ہے
ان سے کچھ خفگی کا سا اظہار کرکے یہ خیال ثابت کیا ہے۔ کہ فضلی نثر کے باوا آدم ہیں۔
ثبوت میں "سب رس" کی دستیابی کا ذکر کیا ہے۔

مولانا کا ارشاد ہے۔ کہ اس طرح اب تک اردو کی پہلی کتاب فضلی سے منسوب
کی جاتی تھی۔ . . . .
لیکن حال میں معلوم ہوا کہ فضلی سے کہیں پہلے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی
گئی تھیں . . . تحقیق و جستجو نے اب انہیں گمنامی سے نکالا ہے۔ انہیں
میں سے ایک قابل قدر کتاب "سب رس" ہے۔

اس کے بعد سلسلہ بیان کے لحاظ سے چاہیئے تھا۔ کہ وہ بیان شروع
ہوجاتا جس کا آغاز یہ ہے۔ کہ "سب رس" کا مصنف وجہی ہے۔ یہ عبداللہ
قطب شاہ کا درباری شاعر تھا وغیرہ" ان دونوں بیانوں کے درمیان اس عبارت
کے ساتھ کہ "ہر زبان میں زمانہ کے لحاظ سے نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے" نظم

پہلے یا نثر پہلے کا قصہ غیر مربوط ہے۔ علاوہ بر آں مولانا نے اس بحث کو بہت تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ لیکن انسانی فطرت، انسانی تمدن کے ارتقا۔ تاریخ السنہ عالم نفسیات جذبات، فلسفۂ جذبات اور انسانی عادات کی تاریخ کے جیسے ہمہ گیر اور دقیق مباحث کو صرف ایک صفحہ میں بیان کر کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے مولانا کے وسعت مطالعہ اور معلومات کے عمق کا اس سے کافی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ "اس کی (اردو کی) ابتدا بھی نظم ہی سے ہوئی اور نثر بعد آئی۔ یہاں تک کہ بعض علمی کتابیں بھی نظم ہی میں لکھی گئیں اور یہی تقریباً ہر زبان میں ہوا ہے" چاہیئے تھا۔ کہ اس مفروضہ کی تائید میں مثالیں دی جاتیں اور تاریخ سے روشنی ڈالی جاتی۔ ایک آدھ فقرہ سے کس طرح کوئی ناظر کتاب تشفی پا سکتا ہے۔ علاوہ بریں دکھنی ادب کی تاریخ کی ابھی جس طرح تحقیق ہونی چاہیئے۔ اس کے لحاظ سے یہ دعوے قبل از وقت ہے ابھی ہم ایک رائے قائم کرتے ہیں اور دوسری تحقیق کی بناء پر اس رائے کو تبدیل کرنا لابد ہو جاتا ہے۔ ادب ریاضی نہیں ہے۔ کہ اس کا ہر مسئلہ یقینی ہو۔ اس حالت میں دکھنی ادب کے متعلق اس طرح قطعی فیصلہ کرنا قابل غور ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ تاریخ ادب اردو پر کوئی مبسوط کتاب مولانا کے زیر تالیف ہے ممکن ہے

کہ اس کے لئے مولانا نے جو تحقیقات کرلی ہے۔ اس کی بنا پر یہ رائے ظاہر فرما
ہو۔ کاش یہاں جو بحث چھیڑی گئی ہے۔ اس کو ذرا پھیلا کر ان سب امور کو ظاہر
کیا جاتا۔

"سب رس" کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے لیکن اس کی روانی اور
سلاست اور پوری ادبی شان بتاتی ہے۔ کہ یہ صورت ایک دم وجہی کی جنبش قلم سے
نہیں پیدا ہو گئی۔ وجہی کی نثر اپنے ماقبل زمانہ کی ایک ارتقائی شکل ہے۔ خود
مولانا کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے۔ کہ ۸۲۵ھ ہجری سے قبل دکھنی نثر میں
کتابیں لکھی جانی شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی رح
کی تصنیف معراج العاشقین کی خود مولانا نے تصحیح فرمائی ہے۔ جو ۸۲۵ھ کے
قبل کی تصنیف ہے۔ گو یہ کوئی ادبی کتاب نہیں ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ
ادبی شان موجود ہے۔ "سب رس" اس کے دو صدی سے زیادہ عرصہ کے بعد
تالیف ہوئی ہے۔ یہ پورا زمانہ بلا تالیف و تصنیف کے کیسے گزر سکتا ہے؟

اس کے قطع نظر دکھنی نظم کی کتاب جو اب تک مولانا کی تحقیقات میں معلوم
ہوئی ہے۔ وہ سلطان محمد قلی کا کلیات ہے۔ سلطان کا زمانہ ۹۸۸ھ سے
۱۰۲۰ھ ہجری تک ہے۔ اس کے کلیات سے یہ ایک نظر ظاہر ہو سکتا ہے

کہ یہ بھی زمانہ قبل کی نظم کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے کی نظم کا نمونہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ؟ سنہ ۸۶۳ھ کی تصنیف قرار دی جاسکتی ہے۔ ہم ایک جدا مضمون کے ذریعہ اس کو روشناس کرا چکے ہیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز کا زمانہ اس سے بھی پہلے کا ہے بہر حال فی الوقت جو مواد پیش نظر ہے۔ اس کے لحاظ سے ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ دکھنی نظم کی ابتدا پہلے ہوئی اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ دکھنی نثر کی ابتدا پہلے ہوئی۔

اس کے بعد مولانا نے دو صفحے وجہی کے حالات میں لکھے ہیں۔ پہلے اس کی تحلیل کر لینی مناسب ہے۔ سب سے پہلا فقرہ یہ ہے۔

"سب رس" کا مصنف وجہی ہے۔ یہ عبد اللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا"۔ اس کے بعد وجہی کے حالات چھوڑ کر قطب شاہوں کی مدح وستایش شروع کر دی ہے۔ پورے ایک صفحہ پر بیان پھیلایا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے پھر وجہی کا تذکرہ شروع کیا ہے اور بیان کیا ہے۔ کہ یہ" کتاب "سب رس" بھی وجہی نے عبد اللہ قطب شاہ ہی کی فرمائش سے لکھی تھی"۔ اس کے ثبوت میں سب رس کے دیباچہ سے عبارت نقل کی ہے۔ جو آدھے صفحہ پر آئی ہے

اس طرح مصنف کتاب کی حیات کے متعلق ان دو صفحوں میں دو سطریں نکل آتیں
سب رس کی ادبی اہمیت خود مولانا نے تسلیم فرمائی ہے۔ اس حالت میں مصنف
کی حیات بھی خود بخود اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔

قطب شاہی شاعروں میں وجہی کی شخصیت نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے
اس نے گولکنڈہ کے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے۔ ایک ولی عہد سلطنت
بلکہ تاجدار کو اپنی مثنوی میں ہیرو کی طرح پیش کیا ہے۔ اس کی فکر دماغ کے
نتائج سے نہ صرف نظم ہی دستیاب ہوئی ہے۔ بلکہ نثر کا بہترین نمونہ بھی ملا ہے،
اس کے عروج کا اصلی زمانہ تو سلطان محمد قلی اور سلطان محمد کا زمانہ ہے عبداللہ
قطب شاہ کے زمانہ میں تو غواصی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ دربار شاہی میں
وجہی کی وہ عزت باقی نہیں رہی۔ جو غواصی کو حاصل تھی۔

ہم منتظر تھے۔ کہ دیکھیں مولانا کے حقیقت نگار قلم کی جولانی اس میدان
میں کیا رنگ دکھاتی ہے اور وجہی کے متعلق مولانا کا قلم جادو رقم کیا کیا گل بوٹے
اگاتا ہے۔ مقدمہ کے اس حصہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ اب پرانی باتیں ہیں
قطب شاہی حکمرانوں کی علم دوستی اور علمی قابلیت ان کے درباروں میں نامور
علما کا موجود ہونا اور اس وقت کی علمی چہل پہل عرصہ سے لوگوں کو معلوم ہے

اس مقدمہ کے ذریعہ ہمیں نہ تو کوئی جدید بات اور نہ کوئی نیا نکتہ معلوم ہوا۔
اس کے بعد مولانا نے دو صفحوں میں وجہی کے تصانیف کو بیان کیا ہے
اس سلسلہ میں مولانا نے اس کی دو اور کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ ایک تاج
الحقائق جو نثر میں ہے۔ دوسری قطب مشتری جو مثنوی ہے۔
مثنوی قطب مشتری کو سب سے پہلے راقم الحروف نے ہی روشناس کرایا ہے
(ملاحظہ ہو معارف جلد ۲۳ نمبر ۶) اور مولف اردو شہ پارے نے کئی صفحات اس
اہم مثنوی کے لئے وقف کئے ہیں جس میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس
طرح چند سال سے سب کو اس کا حال معلوم ہے۔ البتہ تاج الحقائق نئی کتاب ہے
اس حصہ مقدمہ میں ان کتابوں کا نام دیکھتے ہی خیال ہوا کہ آیندہ چند صفحات
میں ان کا حال احوال کھول کھول کر بیان کیا جائے گا اور ان سے مصنف کی حیات
پر جو کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس کو بھی واضح کیا جائیگا اور نیز اس کے انشا اسلوب
پر بھی کوئی سیر حاصل بحث ہو گی۔ لیکن مولانا ان امور کو چھوڑ کر اس معمولی بحث میں پڑ
جاتے ہیں۔ کہ وجہی نے قطب مشتری میں اپنے آپ کو ہمیشہ "وجہی" کیوں لکھا ہے
ایک صفحہ اس میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے "سب رس" کا سنہ
تالیف کو سنہ ۱۰۴۵ھ قرار دے کر اس بارہ میں خود "سب رس" کی عبارت نقل کی

ہے۔ آخر میں یہ تذکرہ کر کے وجہی نے سب رس میں اپنی مثنوی قطب مشتری کا
کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ ساری بحث ختم کر دی ہے۔
وجہی کی مثنوی قطب مشتری کی اہم حیثیت ہے۔ اس کی تصنیف ۱۰۱۸ھ ہجری
میں ہوئی ہے یعنی قطب شاہی عہد کی سب مثنویوں میں قدیم ہے۔ اس سے
مصنف کے حیات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس
مثنوی کی تصنیف ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ یہ مثنوی
غالباً کسی فارسی قصہ کا ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ خود مصنف کی دماغی پیداوار ہے ان
تمام امور کے مدنظر یہ مثنوی وجہی کے تصانیف میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے،
سب رس کے مقدمہ میں خصوصاً جب قطب مشتری کا ذکر آگیا ہے۔ تو اسکے متعلق
کسی صراحت کا نہ ہونا خالی از حیرت نہیں ہے۔
مولانا نے سب رس کے سنہ تصنیف کو ۱۰۴۵ھ قرار دیا ہے،
اس کو دیکھ کر ایک پرانی بات یاد آئی۔ اس کا تذکرہ اس موقعہ پر بے محل نہیں
ہے۔ رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مولانا نے علمی دنیا سے اس کتاب
کا تعارف کرایا۔ ہمیں اول سے اعتراف ہے۔ کہ اس کتاب کو گمنامی سے نکالنے
اور اس طرح دکھنی ادب کی تاریخ کے لئے نیا سالہ فراہم کرنے کا سہرا مولانا کے

ہی سر ہے۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے مولانا نے تحریر فرمایا تھا:۔

"افسوس ہے کہ مصنف نے کتاب میں کہیں سنہ تصنیف نہیں لکھا مجھے اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہوئے ایک کئی سال ہوئے حیدرآباد میں ملا اور دوسرا بیجاپور میں، دونوں نسخے خوش خط اور بہت صاف لکھے ہیں، جس سے مجھے مقابلہ اور صحت میں بہت مدد ملی۔ . . . سلطان عبداللہ ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۱۰۴۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ فضلی کی دہ مجلس سے تخمیناً ایک صدی قبل کی سمجھنی چاہیئے۔ غواصی بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر اور میاں وجہی کا ہم عصر ہے۔ اس کی تصنیف طوطی نامہ کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۲۷ اور ایک دوسری مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ۱۰۳۵ھ ہے سب رس اسی کے لگ بھگ لکھی گئی ہے"۔ اس کے بعد ہی دکن میں اردو شائع ہوئی۔ مؤلف نے "سب رس" کے سنہ تصنیف کے متعلق لکھا ہے۔ کہ حال ہی اردو رسالہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے متعلق ایک دلچسپ مضمون شائع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صاحب مضمون کے پاس دو نسخے ہیں۔ جو سنہ ۱۰۷۱ھ اور سنہ ۱۱۷۷ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ رسالہ اردو میں جو

مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے
کہ باوجود دو مکمل نسخے پیش نظر ہونے کے تاریخ تصنیف معلوم نہیں ہو سکی حالانکہ
خاتمہ کے کچھ پہلے جس کا نمونہ خود مولوی صاحب نے بھی دیا ہے سنہ تصنیف
موجود ہے (صفحہ ۱۷ طبع اول)

اب مولانا "سب رس" کے سن تصنیف کے متعلق مقدمہ میں ارشاد فرماتے ہیں "کہ سب رس
کا سن تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے۔ چنانچہ خاتمہ کتاب میں لکھا ہے۔ کہ بارے جس وقت
تھا، ایک ہزار چہل پنج اس وقت الور پکڑیا یہ گنج"

۱۹۲۴ء میں جب کہ مولانا دونوں نسخوں کو بہ تمام و کمال ملاحظہ فرما چکے
تھے اور تصحیح اور مقابلہ کے مراحل طے ہو چکے تھے۔ سنہ تصنیف کہاں تھا؟
اور اب کہاں سے آگیا؟

اس کو ختم کر کے مولانا نے کتاب کی اہمیت اور خصوصیت پر مختصراً جو بھی
لکھا ہے۔ اس سے ہمیں لفظ بہ لفظ اتفاق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "یہ کتاب
ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ قصہ بھی عجیب
ہے اور طرز بیان بھی عجیب ہے۔ مصنف نے ایک عام اور عالمگیر حقیقت کو مجاز
کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اور حسن اور عشق کی کش مکش اور عشق و دل کے

معرکہ کو قصہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ بڑے مزے کا قصہ ہے اور کون ہے جو اس کوچہ سے ناآشنا ہو اور جس نے اس معرکہ میں چوٹ نہ کھائی ہو۔" خوب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا نے بھی اس کوچہ میں "دل صد پارہ" کی نمائش فروشی" فرمائی ہے۔ لیکن صرف چوٹ کھائی ہے۔ آگے کی کچھ خبر نہیں :-

ذوق ایں بادہ ندانی بہ خدا تا نہ چشی

آگے چل کر سارے مقدمہ کی جان نظر نہ آئی مولانا کی تلاش و تفحص کی داد دینی ہے۔ کہ وجہی کی ایک بڑی چوری پکڑ لی۔ رسالہ اردو کے ابتدائی مضمون اور اس مقدمہ میں تازہ اضافہ صرف یہی جز ہے اور مولانا نے اس کی تیاری میں اپنا کافی وقت صرف فرمایا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: "وجہی نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ کہ یہ قصہ اسے کہاں سے ملا و دیباچہ پڑھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا یہ اس کی ایجاد ہے اور اس کے دماغ کی اپج ہے یہ پُر لطف داستان سب سے پہلے یحییٰ بن سبک فتاحی نیشاپوری نے لکھی۔"

اس کے متعلق مولانا نے چار صفحوں میں اپنے خیالات واضح کئے ہیں اور بلاشبہ اچھی اور صاف صاف بحث کی ہے۔

فتاحی کے حالات وجہی کے حالات سے زیادہ بیان کئے ہیں۔ ان کی

تصانیف کا حال بھی لکھا ہے جس میں ان کے طباعت کا بھی تذکرہ آگیا ہے اور نیز فتاحی کے ترکی ترجموں کا بھی پتہ بتایا ہے اور نیز ہندوستان میں بھی فتاحی کی نظم کی جو نشر ہوئی۔ وہ بھی بیان کردی گئی ہے لیکن واضح ہو۔ کہ خوش قسمتی سے ان سب حالات کے بیان کرنے میں مولانا کو مسٹر آر۔ ایس گرین شیلڈس۔ آئی سی۔ ایس کا بقول مولانا "مختصر دیباچہ" مل گیا جو انہوں نے فتاحی کی مثنوی "دستور عشاق" پر لکھا ہے۔ فتاحی کی یہ کتاب جیسا کہ خود مولانا نے پتہ دیا ہے۔ مسٹر گرین شیلڈس نے ۱۹۲۶ء میں شائع کی، البتہ مولانا نے حسن ودل کے نسخہ کے ایک ہندوستانی نظم کا بھی پتہ چلایا ہے جس کی کتاب جامعہ ممبئی کے کتب خانہ میں ہے۔

اس کے بعد تین صفحوں میں فتاحی کی کتاب کا ماخذ ہونے کے ثبوت میں دونوں کتابوں کا مقابلہ کرکے ثابت کیا ہے اور اس میں یقیناً مولانا کامیاب ہوئے ہیں۔

واضح ہو کہ فتاحی کی کتابوں میں دستور عشاق مثنوی ہے جس میں حسن وعشق کا قصہ نظم کیا ہے۔ اس قصہ کو شاعر نے حسن ودل اور شبستان خیال کے نام سے الگ الگ بھی دستور عشاق کے بعد لکھا ہے۔ حسن ودل نثر میں دستور عشاق

اس کو ایک کامیاب خلاصہ قرار دینے میں کوئی شخص کسی قسم کی رد و کد نہیں کر سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ خلاصہ نہ کہ مقدمہ بقول مولانا شیخ چاند صاحب بجائے خود ہمارے ادب کا نمونہ ہے۔ رواں عبارت صاف اور سلجھا ہوا اسلوب مناسب اور موزوں الفاظ مختصر یہ کہ مولانا نے اپنے زور بیان کا پورا ثبوت دیا ہے اس کے پڑھنے سے واقعی دل پر اثر ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ عبارت کے ساتھ ساتھ جادو بھی چلا ہے۔ مولانا نے درحقیقت موتی بکھیرے ہیں۔

اس کے بعد مولانا نے پھر تقریباً دو صفحے عقل و جذبات کے گورکھ دھندے کو سمجھانے میں صرف کئے ہیں اس بیان میں بھی مولانا نے قلم کی چستی خوب دکھائی ہے لیکن مولانا بعینہ یہی خیالات دوسرے الفاظ اور دوسرے انداز میں اس سے پہلے ظاہر کر آئے ہیں۔ ایک ہی خیال کو بار بار دہرانا گو نئے الفاظ اور نیا اسلوب کیوں نہ ہو ذہن میں کسی قدر گرانی ضرور پیدا کرتا ہے۔ مولانا یہ خیالات ایک ہی جگہ اول یا آخر ظاہر فرماتے تو مقدمہ میں تکرار کا عیب پیدا نہ ہوتا۔

پھر مولانا نے ڈیڑھ صفحے میں فناحی کی شستہ زبان پاک صاف بیان اور اعلیٰ خیالات کی بڑی اچھی داد دی ہے۔ اس کی یہاں ضرورت تھی یا نہیں

اس پر بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ یہ ذوق کی باتیں ہیں۔

آگے چل کر مولانا نے فتاحی اور وجہی کی کتابوں کا مقابلہ کرکے دونوں کے اختلاف کا اچھی طرح ذکر کیا ہے۔ اس بحث کو ختم کرکے مولانا نے وجہی پر بڑی قوت سے گرفت کی ہے۔ ہمیں اس ساری بحث سے لفظ بہ لفظ اتفاق ہے وجہی نے کتاب میں جگہ جگہ پند و نصیحت کا دفتر کھولا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی ساری پند و نصیحت مکڑی کے جال سے زیادہ کمزور ہے جس شخص میں جذبہ دیانت کا اس قدر کال ہو وہ کس برتے اور بل بوتے دوسروں کو اخلاق کا درس دے سکتا ہے۔

ہوسکتا ہے۔ کہ جس زمانہ میں وجہی نے کتاب لکھی۔ اس وقت حسن و دل عام اور متداول کتاب ہو۔ سب لوگ جانتے ہوں۔ کہ "سب رس" کس سے اخذ کی گئی ہے۔ بنا بریں وجہی نے اس کا حوالہ دینا ضروری نہ خیال کیا ہو۔ لیکن اس کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ وہ کتاب صرف اپنے زمانہ ہی کے لئے نہیں لکھ رہا ہے۔ زمانہ آیندہ میں بھی وہ کام آئے گی۔ وجہی کی یہ کمزوری واقعی قابل افسوس ہے۔ اس بارہ میں مولانا کا بیان اس قابل ہے۔ کہ وہ بار بار پڑھا جائے۔ ایک حصہ بیان یہاں پیش کیا جاتا ہے :۔

اور ان کے کلام کا نمونہ پیش ہو چکا تھا۔ ہاں بقول شیخ چاند صاحب مؤلف محبوب الزمن نے سلطان محمد قلی اور اس کے بھتیجے سلطان محمد کے دیوانوں کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا۔

اس کتاب کے شائع ہونے کے تقریباً دس سال بعد رسالہ اردو جلد دوم نمبر ۵ بابت ۱۳۴۷ء شائع ہوا۔ اس میں مولانا عبدالحق صاحب نے سلطان محمد قلی کا کامیاب تعارف بہ حیثیت ایک شاعر کے ناظرین سے کرایا۔ ہر طرف سے داد ملی اور ہر شخص نے احسنت کہا۔ لیکن اس سارے مضمون کو اول سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں بھی صراحتاً اور نہ اشارۃً بلکہ کنایۃً بھی غریب عبدالجبار کا کوئی ذکر خیر نہیں۔ مانا کہ انہوں نے غیر علمی طریقہ سے سلطان محمد قلی کا تعارف کرایا۔ مانا کہ ان کے بیان میں شاعری سے بڑھ کر بادشاہی کے حالات ہیں مانا کہ انہوں نے ایک بھونڈے طریقہ سے کلام کا نمونہ پیش کیا لیکن کیا مولانا نے وجہی کے بیان سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ کہ:۔

"جو کوئی کسی خیال کسی اسلوب یا کسی بات کا موجد ہو۔ اس کا احسان ماننا ضروری ہے اور جس سے کوئی نکتہ حاصل کیا جائے۔ اس کا اعتراف کرنا لازم ہے"۔

کلیات قطب شاہ کو جانے دیجئے۔ خود اس مقدمہ میں اردوئے قدیم دکن میں اردو اور سب رس دو شہ پاروں کا حوالہ کیوں نہیں آیا؟ یہ بات بڑے مزے اور حیرت کی ہے۔

ہم الزام ان دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

اس کے ساتھ مولانا کے شاگرد رشید شیخ چاند صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"یہ بڑی ہمت اور اخلاقی جرأت کی بات ہے۔ کہ اس مدد اور فائدہ کا اعتراف کیا جائے۔ جو دوسروں سے پہنچے۔ عالی ظرف اہل قلم کا شیوہ یہ نہیں۔ کہ دوسروں کی محنتوں سے فائدہ اٹھائیں اور اس کا اعتراف کرنے سے شرمائیں یہ ایک قسم کا غصب ہے جس کو دوسروں کے متاع کے حق میں تنگ نظر روا رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر زور۔ نصیر الدین ہاشمی یا حکیم شمس اللہ قادری تو خیر مولانا کے سامنے دراصل کوئی حقیقت نہیں کہ یہ مولانا سے عمر میں اور معلومات میں بہت چھوٹے ہیں لیکن عبدالجبار تو مولانا کے بزرگ ٹھیرے۔ کم از کم ان کے خدمات کا تو اعتراف کرنا چاہیئے تھا۔ افسوس !!

اس مطلب کو چھوڑ کر مولانا نے وجہی کے طرز بیان اور اسلوب کا ذکر تقریبًا

پارسنوں میں کیا ہے۔ اس بیان میں تصویر کے دونوں رخ دکھانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس بارہ میں جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔ ان سے اختلاف کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی سبب نہیں ہے البتہ خود مولانا کے بیان کے متعلق ہم کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مولانا کے خیالات میں عمیق اور گہرائی کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ "سب رس" کے سرسری مطالعہ سے جو باتیں ایک اوسط درجہ کا طالب علم اخذ کرسکتا ہے تقریباً اسی قسم کے خیالات مولانا نے ظاہر کئے ہیں مثلاً :-

(۱) سب رس میں قافیہ کا التزام کیا گیا ہے لیکن باوجود اس کے اس میں سادگی اور روانی ہے۔

(۲) اپنے زمانہ کے لحاظ سے "سب رس" کی زبان نہایت فصیح ہے۔ اس نے دوسری زبانوں کے ضرب الامثال وغیرہ بے تکلفی سے چلا دیئے ہیں۔

(۳) مصنف اپنی زبان اور شمالی ہند کی زبان میں فرق کرتا ہے۔

(۴) مصنف نے اکثر جگہ قصہ سے گریز کرکے جو امور لکھے ہیں۔ ان سے اس زمانہ کے حالات اور زبان کا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔

(۵) وجہی نے قصہ کے اثنا میں رہ رہ کر نصیحتیں شروع کردی ہیں۔ جو اگرچہ

کام کی باتیں ہیں اور بیان بھی اچھا ہے لیکن قصہ کا لطف اس کی وجہ سے باقی نہیں رہ سکا۔

مولانا نے اس ضمن میں ایک دو جگہ غیر متعلق باتیں بھی لکھ دی ہیں اور اس سے ربط اور تسلسل میں فرق آجاتا ہے۔ مثلاً یہ ذکر فرماتے ہوئے کہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے "سب رس" کی زبان نہایت فصیح ہے۔ "سب رس" کا ایک قول نقل کیا ہے:۔

"آج لگن کوئی اس جہان میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت . . . سوں نظم ہور نثر ملا کر . . . نہیں بولیا"۔

اس سلسلہ میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"دیکھئے کہ وہ اپنی زبان کو دکھنی نہیں ہندی کہتا ہے۔ قصہ کے شروع میں بھی وہ آغاز داستان زبان ہندوستان لکھتا ہے۔

اس کے اس طرح کے ذکر کا یہاں کیا موقع و محل ہے؟

علاوہ ازیں مولانا نے ان سب نقاط پر ایک ایک دو دو چار چار سطریں لکھ کر ساری بحث ختم کر دی ہے۔ باتیں تشنہ کی تشنہ رہ گئی ہیں اور ایجاد عمل کی حد میں پہنچ گئی ہیں۔ اس کے قطع نظر تکرار بھی پیدا ہے۔ مثلاً جہاں بھی

آخر میں مولانا نے سب رس کی عبارتوں سے اس زمانہ کے صرفی و نحوی قاعدوں کا بھی سرسری تذکرہ فرمایا ہے۔ سب رس کو پیش نظر رکھ کر دکن میں اردو کی جو مثنویاں لکھی گئیں۔ سب رس کی تصحیح میں جو نسخے پیش نظر تھے اور صحت میں جو مشکلات پیش آئیں ان کا حال بیان فرما کر یہ مقدمہ جس کو بجائے خود ہمارے ادب کا نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ کوئٹہ میں ۱۲ جون ۱۹۳۲ء کو ختم ہوا ہے۔

ہمارا خیال تھا۔ کہ پوری کتاب سب رس پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے مگر چونکہ سردست اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے صرف مقدمہ کی حد تک ہی نظر ڈالی گئی مگر ہم یہ بیان کریں گے کہ مقابلہ اور تصحیح بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ مولف سے زیادہ مقابلہ کنندہ کو دردسری کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ بڑی قابلیت اور معلومات کی بھی ورنہ اصل مطلب کے ساتھ قوسین کے اندر سوالیہ (؟) نشان کی ضرورت دائمی ہوتی ہے جیسا کہ ذیل کی مثال سے واضح ہو سکتا ہے۔

مولانا نے لچھمی نرائن شفیق کے تذکرہ شعرا (چمنستان شعرا) کی صحت کر کے شائع کیا ہے۔ سید عبدالولی عزلت کے حال میں شفیق نے صراحت کی ہے۔

جانے نہیں دیتے۔ گو یہ درست ہے۔ کہ بعض مرتبہ تلخ حقیقتوں کو واضح کرنے میں ان کا قلم تلخ سے تلخ تر ہو جاتا ہے لیکن اس مقدمہ میں اس کا کوئی نمونہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ عجز و انکساری کی صفت مولانا کے انداز بیان اور اسلوب تحریر سے نہیں ٹپکتی اور معاف فرمائیں بعض وقت خودستائی کی بو آجاتی ہے اور چونکہ خودستائی کے عنوان جدا جدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے اس کے لئے دوسروں کی خوردہ گیری کا شیوہ منتخب نہ کیا ہے۔ دوسری باتوں کو چھوڑ کر صرف ایک بات لیجئے۔ مولف اور مصنف عموماً اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور یہ گویا ان کا قاعدہ ہو گیا ہے اور اس کے پڑھنے کے لئے کان آشنا ہو چکے ہیں لیکن ایسے مولف و مصنف جن کی طبیعت میں حقیقی انکسار رچ جاتا ہے۔ وہ عموماً ایسے مواقع پر جہاں اپنی ذات سے کوئی نسبت دینی ہو صیغہ مجہول استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ تو اس میں خودستائی کا کچھ نہ کچھ رنگ آ ہی جاتا ہے۔ مولانا نے ادائے مطلب کے اس طریقہ کو کم از کم مقدمہ "سب رس" میں استعمال کیا ہے۔

قدیم قلمی کتابوں کو صحیح پڑھنا اور ان کو صحیح طور سے مرتب کرنا جتنا کچھ

دقت طلب اور وقت لینے والا کام ہے۔ وہ اب ایک حقیقت نفس الامر ہے کسی کتاب کو صحیح کر کے اس کے آخر یا اول صحت کے مشکلات کا ذکر کرنا ایک مبتذل قافیہ میں طبع آزمائی کرنے کے مصداق ہے۔ اس شکل کو اس قدر دہرایا جا چکا ہے۔ کہ اب اس میں بالضرور "بھونڈا پن" آگیا ہے۔ افسوس ہے کہ ایسی بھونڈی باتوں کے ظاہر کرنے پر مولانا اب بھی راغب ہیں چنانچہ اس مقدمہ کی تان بھی اس پر ٹوٹی ہے۔ یہ باتیں مبتدیوں کے ظاہر کرنے کی ہیں۔ اہل علم کب تک ایسی چھوٹی باتوں کو فخر و امتیاز کی نشانی کے لئے ظاہر کرتے رہیں گے ؟

رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مولانا نے علمی دنیا سے اس کتاب کا تعارف کرایا اور وعدہ فرمایا تھا۔ کہ "یہ کتاب عنقریب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کی جائے گی۔ شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں مفصل فرہنگ ہوگی کتاب کی صحت بڑی احتیاط اور غور سے کی گئی ہے۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ کتاب اس زمانہ میں تصحیح کے مراحل طے کر چکی تھی لیکن پھر بھی کتاب کے طبع اور شائع ہونے میں آٹھ سال گذر گئے مولانا نے خود اس تاخیر کو محسوس فرمایا ہے اور اب مقدمہ کے آخر میں لکھا

جانے نہیں دیتے۔ گو یہ درست ہے۔ کہ بعض مرتبہ تلخ حقیقتوں کو واضح کرنے
میں ان کا قلم تلخ سے تلخ تر ہو جاتا ہے لیکن اس مقدمہ میں اس کا کوئی نمونہ ہماری
نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ عجز و انکساری کی صفت مولانا کے انداز بیان اور اسلوب
تحریر سے نہیں ٹپکتی اور معاف فرمائیں بعض وقت خودستائی کی بو آجاتی ہے
اور چونکہ خودستائی کے عنوان جدا جدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے اس کے لئے
دوسروں کی خوردہ گیری کا شیوہ منتخب نہ کیا ہے۔ دوسری باتوں کو چھوڑ کر صرف
ایک بات لیجئے۔ مولف اور مصنف عموماً اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال
کرتے ہیں اور یہ گویا ان کا قاعدہ ہو گیا ہے اور اس کے پڑھنے کے لئے
کان آشنا ہو چکے ہیں لیکن ایسے مولف و مصنف جن کی طبیعت میں حقیقی
انکسار رچ جاتا ہے۔ وہ عموماً ایسے مواقع پر جہاں اپنی ذات سے کوئی نسبت
دینی ہو صیغہ مجہول استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ان دونوں طریقوں
کو چھوڑ کر واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ تو اس میں خودستائی کا کچھ
نہ کچھ رنگ آ ہی جاتا ہے۔ مولانا نے ادائے مطلب کے اس طریقہ کو کم از کم
مقدمہ "سب رس" میں استعمال کیا ہے۔

قدیم قلمی کتابوں کو صحیح پڑھنا اور ان کو صحیح طور سے مرتب کرنا جتنا کچھ

وقت طلب اور وقت لینے والا کام ہے۔ وہ اب ایک حقیقت نفس الامر ہے
کسی کتاب کو صحیح کرکے اس کے آخر یا اوّل صحت کے مشکلات کا ذکر کرنا ایک
مبتذل قافیہ میں طبع آزمائی کرنے کے مصداق ہے۔ اس شکل کو اس قدر دہرایا
جا چکا ہے۔ کہ اب اس میں بالضرور "بھونڈاپن" آگیا ہے۔ افسوس ہے کہ
ایسی بھونڈی باتوں کے ظاہر کرنے پر مولانا اب بھی راغب ہیں چنانچہ ان
مقدمہ کی تان بھی اس پر ٹوٹی ہے۔ یہ باتیں مبتدیوں کے ظاہر کرنے کی
ہیں۔ اہل علم کب تک ایسی چھوٹی باتوں کو فخر و امتیاز کی نشانی کے لئے
ظاہر کرتے رہیں گے؟

رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مولانا نے علمی دنیا سے اس کتاب
کا تعارف کرایا اور وعدہ فرمایا تھا۔ کہ "یہ کتاب عنقریب انجمن ترقی اردو کی جانب
سے شائع کی جائے گی۔ شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں مفصل فرہنگ ہوگی
کتاب کی صحت بڑی احتیاط اور غور سے کی گئی ہے۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ کتاب اس زمانہ میں تصحیح کے مراحل طے
کر چکی تھی لیکن پھر بھی کتاب کے طبع اور شائع ہونے میں آٹھ سال گذر گئے
مولانا نے خود اس تاخیر کو محسوس فرمایا ہے اور اب مقدمہ کے آخر میں لکھا

ہے۔ کہ :۔

"اوّل تو قلمی نسخوں کا پڑھنا جن کے رسم خط کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسی پرانی زبان کا پڑھنا اور سمجھنا جس کے اکثر محاورے اور الفاظ نہ اب بولے جاتے ہیں اور نہ سمجھے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر کاتبوں کی اصلاح یہ ایسی دقتیں ہیں۔ کہ مقابلہ، تصحیح اور تحقیق میں بہت وقت صرف ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس کتاب کے چھپنے میں اتنی دیر ہو گئی"

لیکن آج سے آٹھ سال قبل ہی مولانا ارشاد فرما چکے ہیں۔ کہ یہ زینہ طے ہو چکا ہے۔ البتہ یہ آٹھ سال نساخی اور اس کی تصانیف کا پتہ چلانے اور مقابلہ کرنے میں صرف ہوئے۔ کیونکہ اس آٹھ سالہ مدت میں سوائے اس ایک اضافہ کے کوئی اور اضافہ قابل تذکرہ نہیں ہے۔

واضح ہو کہ علمی کتابوں کی نکاسی کا ہندوستان میں جو عالم ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ پھر قدیم دکھنی ادب کی کتابوں کی نکاسی کے لئے تو صبر و انتظار کی ساری منزلیں طے کر دینی پڑتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو لاکھ علمی انجمن ہوا کرے اور لاکھ اس کا مقصد قدیم ادب کو زندہ کرنا ہو۔ لیکن آخر اس کو بھی اپنی مطبوعات کے لئے بازار فراہم کرنا لابد ہے۔ بازار بھی فراہم ہوا اور انعام و صلہ کا میدان

بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ بہرحال اس اثنا میں سب رس جامعہ عثمانیہ کے
ایم۔ اے کے درسی کتابوں میں شامل کرادی گئی۔ لگا کہ تو ظاہر ہے کہ کم
میں گے لیکن چونکہ اب یہ کام جامعہ عثمانیہ کی خاطر ہوا ہے۔ اس لئے انشاءاللہ
انعام وصلہ کا میدان ہاتھ سے نہ جائے گا۔

مولانا اس زمانہ میں مسند نشین بزم ادب ہیں اگر ان کی رواں اور شستہ
تحریر سے زبان ومحاورہ وغیرہ کی غلطیاں نکالی جائیں۔ تو ان کو بلا کسی ردوکد
کے کاتب اور سنگساز کے سر تھوپ دیا جائیگا۔ تماشا ہے کہ یہ کم بخت مولانا کی
تحریر کو بھی مسخ کر دینے سے نہیں چوکتے۔ چونکہ یہ تحریریں بھی بہت طویل ہو
گئی ہے۔ اس لئے اب صرف اس نقطۂ نظر سے مقدمہ پر ایک بہت سرسری
نظر ڈال کر ہم اس تنقید کو ختم کر دیں گے۔

۱۔ پرانی باتیں دل سے نکلتے ہی نکلتی ہیں ص۱ سطر ۳ اس کا مطلب
ہماری سمجھ میں تو نہ آیا۔ شاید مولانا کی مراد یہ ہے۔ کہ پرانی باتیں، دل سے نکلتے
نکلتے ہی نکلتی ہیں۔

۲۔ اردو کی پہلی کتاب فضلی سے منسوب کی جاتی ہے۔

یہاں اردو کی پہلی کتاب سے مولانا کا مفہوم ادا نہیں ہوا۔ کیونکہ اردو کی پہلی کتاب نثر کی بھی ہو سکتی ہے اور نظم کی بھی۔ بلکہ نظم و نثر دونوں کی اور وہ اردو کی پہلی کتاب بھی جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے (جس کو خود انجمن نے بھی درس عثمانیہ کے نام سے شائع کیا ہے اور جو چھوٹے بچوں کے لئے مرتب ہونے کے باوجود کتابت اور سنگسازی کی بیسیوں غلطیاں رکھتی ہیں) یہاں مولانا غالباً "اردو نثر کی پہلی کتاب" لکھنا چاہتے ہوں گے لیکن بھول گئے۔

۳۔ گانا اور ناچنا انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ فطرت میں ہر جگہ ناچ اور گانا نظر آتا ہے ص۲ سطر ۱۵۔

یہاں دونوں جملوں میں ایک محض حشو ہے۔

(۴) دکھنی یعنی قدیم اردو ص۳ سطر ۱۹

دکھنی لکھنا کافی ہے۔ اس کے ساتھ قدیم اردو کا اضافہ غیر ضروری ہے مولانا نے بعض جگہ دکھنی اور بعض جگہ اردو اور بعض جگہ قدیم اردو سے ایک ہی مراد لی ہے۔ اس لئے بعض وقت بڑا خلط بحث ہو جاتا ہے۔

(۵) قطب شاہی بادشاہوں کے عہد میں دکھنی کو بہت فروغ ہوا۔ یہ علم و ہنر

کے بڑے سرپرست تھے۔ شعراء اور علماء ان کے دربار کی رونق تھے۔ خود ان میں سے بعض بڑے پایہ کے شاعر ہوئے ہیں۔ صفحہ ۳ "خود ان میں سے بعض" سے مولانا کی کیا مراد ہے۔ آیا علماء اور شعرا یا قطب شاہی بادشاہ مراد ہیں لیکن اُن کی ضمیر سے قریب تر جو اسم ہے وہ علماء اور شعراء ہے۔ بہ لحاظ قاعدہ ان کا مرجع علما اور شعرا ہونا چاہیئے۔

۶۔ اہلِ ہند سے مراد مصنف کی ہمیشہ شمالی ہند والے ہیں۔ اس جملہ کی نشست میں کچھ گڑبڑ سی ہے۔ اس میں بھی کوئی ایک جملہ حشو ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک غلط نامہ بھی شامل ہے لیکن افسوس ہے کہ مقدمہ کی غلطیوں کے لئے کوئی جگہ نہ آئی۔ طباعت کی غلطیوں کا بتانا بدمذاقی ہے لیکن چونکہ مولانا کے دبستانِ تنقید میں اس پر بھی گرفت کی جاتی ہے اس لئے ایسی چند غلطیوں کا بھی ظاہر کرنا بے محل نہیں ہو سکتا۔

۱۔ اطلاح بجائے اطلاع صفحہ ۲۰ سطر ۱۸

۲۔ برافرختہ بجائے برافروختہ صفحہ ۲۹ سطر ۲

۳۔ بردری بجائے پروری

۴۔ پرلشان بجائے پریشان صفحہ ۱۰

۵۔ مفت بجائے منت صفحہ ۱۷

ایک اور امر قابل ذکر ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں :۔" ایک بات البتہ سمجھ میں نہ آئی۔ کہ اس مثنوی میں وہ ہر جگہ اپنا نام وجہی لکھتا ہے۔ . . . لیکن "سب رس" میں جہاں کہیں اس کا نام آیا ہے وہاں وجہی لکھا ہے۔ . ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وجہی اور وجیہی دونوں طرح اپنا نام لکھا ہے"۔

مولانا کا ارشاد ہے۔ کہ یہ بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن ہماری سمجھ میں ایک بات آئی ہے ممکن ہے۔ کہ صحیح ہو اور ممکن ہے غلط ہو۔ واضح ہو کہ وجہی یا وجیہی نام نہیں ہے۔ بلکہ تخلص ہے۔ البتہ یہ تخلص اس نے اپنے نام کی نسبت سے اختیار کیا ہے۔ اس کے نام کی اب تک کسی نے تحقیق نہیں کی ہے۔ اس کا نام وجہ الدین یا وجیہہ الدین ہی سے کوئی ایک ممکن ہے۔

وجہ کے معنی جہاں منہ کے ہیں۔ وہاں سید القوم وغیرہ کے بھی آتے ہیں۔ اس طرح وجیہہ کے معنی جہاں عزت دار وغیرہ کے ہیں۔ وہاں سید القوم کے بھی ہیں۔ چونکہ اس نے اپنا تخلص اولاً وجہی قرار دیا ہے۔ اس لئے

قیاس چاہتا ہے۔ کہ اس کا نام وجیہہ الدین ہے۔

وجیہہ کی نسبت از روئے قاعدہ وجہی ہوتی ہے۔ جیسے کہ مدینہ سے مدنی اور جہنیہ سے جہنی لیکن وجیہہ کی نسبت خلاف قیاس وجیہی بھی آتی ہے جیسے سلیقہ کی نسبت سلیقی خلاف قیاس آتی ہے۔ یہ ثابت ہے۔ کہ مثنوی قطب مشتری پہلی تصنیف ہے اور اس میں شاعر نے وجیہی تخلص استعمال کیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے۔ وہ حسب قاعدہ وجہی تخلص استعمال کرنے لگا۔ اور اس کو اس نے سب رس میں استعمال کیا ہے۔ اگر اس کے دو تخلص ہوتے۔ جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے۔ تو ضرور تھا۔ کہ وہ ہر کتاب میں کہیں وجہی اور کہیں وجیہی لکھتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ قیاس کرنا ناگزیر ہے۔ کہ اس نے اولاً وجیہی تخلص اختیار کیا اس کے بعد اس کو ترک کر کے وجہی اختیار کیا۔ یہ حل ہے۔ وجیہی اور وجہی کے معمے کا۔ ع

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

ہمیں افسوس ہے۔ کہ تحریر بہت طویل ہو گئی اور اس میں بعض جگہ غالباً تلخی بھی پیدا ہو گئی ہے لیکن کتابوں کے متعلق اس قسم کی کھری کھری تنقید

کرنے کا ڈھنگ خود مولانا کا ہی نکالا ہوا ہے۔ اس لئے ہم نے خود مولانا کی کتاب پر تنقید کرنے میں اس کی تقلید کی ہے۔

ایک زمانہ تھا۔ کہ لوگ مولانا کے مقدمات کو سارے ادبی و علمی معائب سے منزا خیال کرتے تھے۔ مگر اب وہ زمانہ کہاں۔

جو کچھ ہم نے لکھا ہے۔ وہ کسی خصومت کی بنا پر نہیں ہے۔ مولانا ہمارے بزرگ ہیں۔ ہم ان کا ہمیشہ ادب اور لحاظ کرتے رہے ہیں۔ اور انشاءاللہ آیندہ بھی کریں گے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ فقط

رہبر دکن ۱۳۴۲ ف

اردو لٹریچر مصنفہ ڈاکٹر بیلی اور رسالہ اردو

ڈاکٹر بیلی نے جو لنڈن یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ حال میں ایک کتاب انگریزی زبان میں اردو ادب کے متعلق تصنیف کی ہے، اس پر آیندہ تفصیلی تنقیدی نظر ڈالی جائے گی۔ اس وقت ہم کو ان چند امور پر توجہ کرنی ہے۔ جو اس کتاب کے متعلق رسالہ اردو کی تنقید میں ظاہر ہوئے ہیں۔

اس امر کا اعتراف نہ کرنا درحقیقت بڑی ناانصافی ہے۔ مگر اسی عیب میں
خود مولانا بھی مبتلا ہیں۔ اس کے متعلق ہم نے تفصیل سے مقدمۂ سب رس
کی تنقید میں صراحت کی ہے۔ مولانا بڑے شد و مد اور طمطراق سے ہر مصنف
کو یہ مشورہ دیا کرتے ہیں۔ کہ "جو کوئی کسی خیال کسی اسلوب یا کسی بات کا موجد
ہو۔ اس کا احسان ماننا ضروری ہے اور جس سے کوئی نکتہ حاصل کیا جائے اس کا
اعتراف کرنا لازم ہے۔" مگر جب خود مولانا کے خامۂ جادو رقم سے کسی کتاب کا مقدمہ
یا کوئی مضمون وجود میں آتا ہے۔ تو اس حقیقت کو فراموش کر جاتا ہے۔ چنانچہ
سب رس والی تنقید میں بتایا جا چکا ہے۔ کہ کس طرح مولانا نے عبدالجبار ملکاپوری
حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر زور اور دوسرے مولفوں کی تحقیقات سے بلا تامل
استفادہ کر لیا اور حوالہ دینے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

نفس واقعہ یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب میں قدیم اردو کے متعلق
جس جس کتاب سے جو کچھ اخذ کیا ہے۔ اس کا حوالہ فہرست ماخذات میں دے
دیا ہے۔ مثلاً اردو شہ پارے۔ دکن میں اردو۔ اردوئے قدیم وغیرہ۔ اس سے
واضح ہے۔ کہ ڈاکٹر زور نے رسالہ اردو کی تحقیقات سے استفادہ نہیں کیا
مرتب حالت میں جب مواد مہیا ہو گیا ———————

تو پھر نیر مرتب مضامین رسالوں سے مواد اخذ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ غالباً اسی بنا پر رسالہ اردو سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ اُن کا حوالہ دینا بھی ضروری نہیں تھا۔

(۲) دوسرا اعتراض حسب ذیل کیا گیا ہے:۔

"اس چھوٹی سی کتاب کو جس کا حجم سو صفحے سے زیادہ نہیں ایسے شاعروں کے ذکر سے جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے ایسے اشخاص کے تذکرے سے جنہیں شاعر کہنا بد ذوقی کی دلیل ہے۔ زیر بار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔ عجب بات ہے۔ کہ بعض ایسی بے حقیقت کتابوں کا ذکر کردیا ہے۔ جن کے مصنف گمنام و بے نشان ہیں اور بعض ایسے غیر معروف اور ناقابل لحاظ شاعروں کے نام آگئے ہیں جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی۔"

ڈاکٹر بیلی کے متعلق یہ اعتراض صرف اعتراض کی حد تک ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر مولانا تفصیل نہیں۔ تو صرف ایک آدھ مثال سے ہی اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے تھے حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ ڈاکٹر بیلی نے نہایت

انصاف کے ساتھ غیر طرفدارانہ طور پر دکن اور شمالی ہند کے شعرا اور مصنفین کو پیش کیا ہے اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے:۔

۳۔ تیسرا اعتراض حسب ذیل ہے :۔

ڈاکٹر صاحب نے چند مباحث کے متعلق ذاتی جدت کا دعوے کیا ہے۔ مثلاً (۱) اردو کی ابتدائی تاریخ کی ابتدا اور رسل (۲) اردو میں دکن کی اہمیت اور دکنی شعرا کا ذکر (۳) تحسین کی نوطرز مرصع، میر امن باغ و بہار اور امیر خسرو کے چہار درویش کے متعلق جدید معلومات لیکن کتاب کے مطالعہ سے اس جدت کی ساری حقیقت معلوم ہو جاتی ہے (نمبر ۱) کلیۃً پروفیسر شیرانی کی تصنیف تالیف پنجاب میں اردو سے ماخوذ ہے (نمبر ۲) رسالہ اردو کے مضامین اور اردوئے قدیم یا ان دونوں کے خوشہ چینیوں سے منقول ہے۔ (نمبر ۳) راقم کے مقدمہ باغ و بہار کا رہین منت ہے البتہ یہ ضرور ہے۔ کہ یہ چیزیں اب تک انگریزی سے روشناس نہیں ہوئی تھیں۔"

ایک بڑے شخص کے قلم کے لئے جو اپنے سن و سال کے کئی دہائی گزار چکا

ہے۔ اس قسم کے الفاظ ایک غیر زبان کی کتاب کے لئے ہرگز شایاں نہیں ہو سکتے۔ یہی اعتراض اس سے بہتر صورت میں دوسرے الفاظ میں کیا جا سکتا تھا
ڈاکٹر بیلی کی کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے دعوے کیا کیا ہے۔ مولانا کا یہ دعوے ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ کہ ڈاکٹر بیلی نے تمام تر پنجاب میں اردو اور رسالہ اردو یا اردوئے قدیم سے مواد اخذ کیا ہے۔ شاید مولانا کو معلوم نہیں۔ کہ رسالہ اردو میں جو چند مضامین قدیم اردو کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ اس سے بہت زیادہ مواد دوسری کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اور ڈاکٹر بیلی نے تفصیل کے ساتھ اپنے ماخذوں کا ذکر کر دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل تحریر ہے۔ کہ مولانا کے مقدمہ "باغ و بہار" سے پہلے ڈاکٹر بیلی نے اپنی تالیف ختم کر دی تھی۔ البتہ اس کی اشاعت بعد میں ہوئی۔ اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ زبان انگریزی میں ڈاکٹر بیلی سے پہلے کسی نے بھی اس قدر تفصیل کے ساتھ ان امور پر روشنی نہیں ڈالی تھی۔ اس لئے اگر ڈاکٹر بیلی نے یہ دعویٰ کیا ہے تو اس کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔

دوسری قسم کے اعتراضات وہ ہیں۔ جو نفس مضمون کے متعلق ہیں۔ قدیم اردو کے متعلق جو تحقیقات اس وقت ہوئی ہے۔ اس کا آج سے پندرہ بیس

سال قبل تک خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ آیندہ پندرہ
بیس سال میں اس سے زیادہ معلومات حاصل ہو جائیں اور اس کے لحاظ
سے ہمارے موجودہ معلومات صحیح قرار نہ پائیں۔ اس کے علاوہ قدیم شعرا اور
ان کے تصانیف کے متعلق ایک دشواری یہ بھی ہے کہ کاتبوں کی عنایت
سے اشعار اور الفاظ مسخ ہو جاتے ہیں اور ان شعرا کے متعلق صحیح معلومات
کا ذریعہ بجز انہی کتابوں کے کوئی اور نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر کسی شاعر کے
نام اور تخلص کے متعلق کوئی دعوے کیا جائے اور کوئی دوسرا شخص اپنی معلومات
کے لحاظ سے اس کو غلط قرار دے۔ تو یہ کوئی بڑی بھاری منطقی اور ناقابل معافی
جرم نہیں ہو سکتا۔ نفس مضمون پر اس خامی سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو اعتراضات
مولانا نے ڈاکٹر بیلی کی کتاب پر کئے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اسی قسم کے
ہیں۔ مثلاً :-

(۱) قصہ ابو شحمہ کا مصنف محمد امین نہیں۔ بلکہ ادلیا ہے۔

مولانا اپنے دعوے میں جو ثبوت پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ میرے
پاس اس کے متعدد نسخے ہیں۔ کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا۔ بلکہ ہر نسخے
کے آخر میں اس کا نام ادلیا لکھا ہوا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ مولانا اولیا کے متعلق کسی تاریخ یا تذکرہ سے ثبوت پیش نہیں کرتے۔ بلکہ چند نسخوں میں جو نام لکھا ہوا ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔

(۱) ڈاکٹر بیلی نے جو نام لکھا ہے۔ وہ بلوم ہارٹ کی کیٹلاگ اور ڈاکٹر زور کے اردو شہ پارے اور انڈیا آفس کے اصل مخطوطہ قصہ ابوشحمہ سے اخذ کیا ہے۔ ہماری رائے بھی یہی ہے۔ جو "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں ظاہر کی گئی ہے یورپ کے نسخہ کے علاوہ جو نسخے یہاں ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ ان میں اولیا نہیں ہے۔ بلکہ صاف طور پر امین کی صراحت ہے۔ اس طرح اگر مولانا اپنے نسخوں کے لحاظ سے قصہ ابوشحمہ کے مصنف کو اولیا قرار دیتے ہیں۔ تو ہم اس کے مصنف کو اپنے نسخوں کے لحاظ سے امین قرار دیتے ہیں۔

۲۔ ملک خوشنود کی ایک تصنیف یوسف زلیخا بتائی گئی ہے . . . .

. . . . خوشنود نے یوسف زلیخا نہیں لکھی۔

مولانا کا یہ دعویٰ کس بنا پر ہے۔ اس سے ہم واقف نہیں۔ کیونکہ کوئی ثبوت اپنے دعوے کی تائید میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ انڈیا آفس میں جو نسخہ ملک خوشنود کی ہشت بہشت کا ہے۔ اس میں مصنف نے واضح کیا ہے۔ کہ اس نے یوسف

زلیخا نام ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے بعد ہم مجبور ہیں۔ کہ مولانا کے دعوے کو جو بلا دلیل ہے۔ ناقابلِ قبول قرار دیں۔ کیونکہ جب خود ملک خوشنود اس امر کا معترف ہے کہ اس نے یوسف زلیخا لکھی ہے۔ تو پھر علامہ ممدوح کا دعوےٰ کس حد تک قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

۲۔ مصنف قصہ ملکہ مصر کا نام محمد علی عاجز غلط ہے۔ اس نے اپنی تصنیف میں اپنا نام محمود بتایا ہے۔

مولانا کا یہ دعوےٰ بھی کسی تاریخ یا تذکرہ سے نہیں۔ بلکہ مصنف کی کتاب سے ہے۔ ممکن ہے۔ کہ یہ صحیح نہ ہو۔ نہ صرف ڈاکٹر بیلی بلکہ مصنف اردوئے قدیم اور مؤلف اردو شہ پارے کی رائے بھی یہی ہے۔ کہ قصہ ملکہ مصر کا مصنف سید محمد عاجز ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کا دعوےٰ بھی صحیح ہو۔ مگر کثرت کو ترجیح دی جانی چاہیئے۔

اسی ضمن میں مولانا وہ شعر نقل کر کے جس سے مولف کے نام کا محمود ہونا واضح ہوتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ غلطی اردوئے قدیم سے بے سمجھے نقل کرنے سے ہوئی ہے۔"

مولانا کی اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصنف اردوئے قدیم نے تو

ملکہ مصر کے مصنف کو محمود لکھا ہے۔ مگر ڈاکٹر بیلی نے غلطی سے سید محمد قرار دیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ مصنف اردوئے قدیم نے بھی سید محمد ہی لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو اردوئے قدیم کا حسب ذیل بیان :-

"عاجز سید محمد نام ہے۔ دکن کے رہنے والے تھے۔ دکھنی سلطنتوں کی تباہی اور عالمگیر کی فتوحات کا زمانہ انہوں نے دیکھا ہے۔ ان کی تصانیف سے ایک چھوٹی سی مثنوی دکن میں نہایت مقبول اور قصۂ ملکہ مصر کے نام سے مشہور ہے۔" ص ۹۵ طبع ثانی

اب سمجھ میں نہیں آتا۔ آیا مولانا کو سچ سمجھیں یا مؤلف اردوئے قدیم کو۔ مولانا نے اردوئے قدیم میں نہیں معلوم کیونکر سید محمد کی جگہ محمود پڑھ لیا۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

(۱۴) ابوطالب طالب بلندہ کے باشندہ تھے۔ میر حسن اور قائم نے بھی یہی لکھا ہے۔ کہ بلندہ میں مضافات اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے حیدرآبادی لکھ دیا ہے۔"

یہی ایک اعتراض ہے جس کے متعلق خوش قسمتی سے مولانا نے کچھ ثبوت پیش کیا ہے اور وہ بھی میر حسن اور قائم کے تذکروں کا جو قدیم اردو

ادب کے متعلق کسی طرح سند نہیں ہو سکتے۔

غالب کوئی مشہور شاعر نہیں ہے۔ ولی جیسے مشہور شاعر کے وطن کے متعلق ایک زمانہ تک بحث ہوتی رہی۔ تو پھر ایک غیر مشہور شاعر کے متعلق اگر بجائے اورنگ آباد کے حیدرآباد لکھ دیا گیا۔ تو کوئی بڑی قابل گرفت غلطی نہیں قرار دی جا سکتی خصوصاً اس وقت جب کہ اورنگ آباد حیدرآباد کا ہی ایک صوبہ ہے اور دکھنی شعرا عہدِ حاضر میں حیدرآباد پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے عام طور پر اسی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

۵۔ شاہی کے متعلق مولانا ڈاکٹر بیلی کی ناخوشی ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں "شاہی دو ہیں، ایک علی عادل شاہ شاہی اور دوسرے شاہ تقی خان شاہی۔ دونوں کے مرثیے قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں۔"

مولانا کی تحقیقات سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ علی عادل شاہ شاہی کے صرف مرثیے صاحب موصوف کی نظر سے گذرے ہیں۔ حالانکہ کلیات شاہی کو علمی دنیا سے رسالہ معارف (مئی ۱۹۲۲ء) میں روشناس کرایا جا چکا ہے۔ اور وہ کلیات دفتر دیوانی و مال (حیدرآباد) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ کیا مولانا اس کلیات سے ناواقف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ایک محقق اردو کے لئے قابل تعجب

کے علمبردار اس کے متعلق مولانا کے اعتراضات پر غور کریں۔ تو وہ سب نقش برآب ثابت ہوں اور اس امر کو اظہر من الشمس کر دیں۔ کہ مولانا ہر اس شخص سے خار رکھتے ہیں۔ جو اردو ادب کی تاریخ کے کسی پہلو پر مولانا سے آزاد رہ کر کام کرتا ہو۔ اور کام کرنے کے بعد اس کتاب یا رسالہ کو مولانا کے اسم گرامی پر معنون نہ کرتا ہو۔

مندرجہ صدر تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ مولانائے محترم نے اعتراضات کی جو فرد مرتب کی ہے۔ اس کا وزن کیا ہے؟ اس سے ڈاکٹر بیلی کی کتاب کی ذرر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ انشاء اللہ کبھی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

رسالہ شاہجہاں دہلی ۱۹۲۴ء

مغل اور اردو پر ایک سرسری نظر

نواب سید نذیر حسین خاں صاحب خیال کو زبان اردو کے ساتھ جو شغف ہے۔ اس سے ہم لوگ بخوبی واقف ہیں۔ آپ کے اسی انہماک کا نتیجہ تھا۔ کہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں آل انڈیا اردو کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس

ہوا۔ تو اس کی صدارت کے لئے قرعۂ فال آپ ہی کے نام پڑا۔ اور آپ کا خطبہ صدارت پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔

داستانِ اردو کے نام سے آپ نے ایک کتاب تالیف کی ہے، اگرچہ یہ اب تک شائع نہیں ہوئی، مگر اس کا ایک باب "مغل اور اردو" کے نام سے ابھی شائع ہوا ہے اور اس وقت زیر بحث ہے۔

ابتدائی نو صفحے آپ کے سوانح سے متعلق ہیں جس کو شائق احمد صاحب نے لکھا ہے، اس کے بعد دس صفحوں کا مقدمہ جمیل مظہری صاحب ایم۔ اے کا لکھا ہوا ہے۔ پھر دس صفحے فہرستِ مضامین کے ہیں، ان کے بعد نفس مضمون کل ۱۶۸ صفحوں میں مندرج ہے۔ اس حصۂ کتاب کا خط اس قدر جلی ہے کہ معمولی کتابوں کے خط میں وہ اس سے نصف جگہ میں بھی چھپ سکتا ہے۔

"مغل اور اردو" کے ذیلی عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

مغل اور اردو۔ ہمایوں اور اردوئے معلّیٰ۔ سلیم اور اردوئے معلّیٰ۔ نورجہاں اور اردوئے معلّیٰ۔ اسی طرح خرم۔ دارا شکوہ۔ عالمگیر ثانی۔ شاہ عالم جہاندار شاہ۔ سلیمان شکوہ۔ اکبر ثانی اور بہادر شاہ ثانی کے ناموں کے ساتھ اردوئے معلّیٰ کی صراحت ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ایک دو عنوان اردو اپنے

کے علمبردار اس کے متعلق مولانا کے اعتراضات پر غور کریں۔ تو وہ سب نقش بر آب ثابت ہوں اور اس امر کو اظہر من الشمس کر دیں۔ کہ مولانا ہر اس شخص سے خار رکھتے ہیں۔ جو اردو ادب کی تاریخ کے کسی پہلو پر مولانا سے آزاد رہ کر کام کرتا ہو۔ اور کام کرنے کے بعد اس کتاب یا رسالہ کو مولانا کے اسم گرامی پر معنون نہ کرتا ہو۔

مندرجہ صدر تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے۔ کہ مولانائے محترم نے اعتراضات کی جو فرد مرتب کی ہے۔ اس کا وزن کیا ہے؟ اس سے ڈاکٹر بیلی کی کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ انشاء اللہ کبھی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

رسالہ شاہجہاں دہلی ۱۹۳۴ء

مغل اور اردو پر ایک سرسری نظر

نواب سید رضا حسین خاں صاحب خیال کو زبان اردو کے ساتھ جو شغف ہے۔ اس سے ہم لوگ بخوبی واقف ہیں۔ آپ کے اسی انہماک کا نتیجہ تھا۔ کہ سنہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں آل انڈیا اردو کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس

۱۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ مولوی شائق احمد صاحب نے نواب نبیال کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ درحقیقت اس کی خاص ضرورت ہے۔ کیونکہ آئندہ نسل کو جب تک مصنف و مؤلف کے حالات معلوم نہ ہوں۔ ان کو اسی طرح دقت کا سامنا ہوگا۔ جیسا کہ زمانہ سلف کے مصنفین کے حالات کے متعلق ہم کو آج دقت ہوتی ہے۔ مگر ہم کو تعجب ہے کہ اس بیان میں جہاں معمولی معمولی غیر اہم حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ایک اہم واقعہ کو جو نواب صاحب کی زندگی سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کی کوئی خاص وجہ بھی ہمارے سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ فروگذاشت ان کے حیدرآباد کی ملازمت کے متعلق ہے مرسیدعلی امام مرحوم کے زمانہ صدارت عظمیٰ میں وہ یہاں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے مامور تھے اور ایک عرصہ تک حیدرآباد میں مقیم رہے ہے۔

(۲) "عالمگیر اور اردوئے معلیٰ" کے عنوان کو چھ جلی صفحوں میں لکھا گیا ہے دگر یا خفی قلم سے تین صفحے ہوتے، عالمگیر کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ ناکافی ہے، اس میں بہت کچھ اضافہ کی گنجائش تھی۔ عالمگیر نے اردو زبان کے شعرا کی ہو سرپرستی فرمائی۔ اس کے اظہار کی خاص ضرورت تھی۔ کیونکہ عام طور پر یہ

خیال کیا جاتا ہے۔ کہ عالمگیر کو شعرا سے خاص نفرت تھی اور وہ شعر و شاعری کی قدر نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت کے خلاف ہے۔ اس وقت ہمارا یہ موضوع نہیں۔ ورنہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتے۔ مگر ہم اس قدر ضرور اضافہ کرتے ہیں کہ جب عالمگیر نے دکن کو فتح کیا۔ تو دکھنی شاعروں کو طلب کر کے اُن کے کلام کو سنا اور ان میں سے نصرتی کو اُس کے کلام کے لحاظ سے ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز و سربلند کیا چنانچہ تذکرہ فتوت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"وقتیکہ شاہ اورنگ زیب غازی انار اللہ برہانہ ولایت دکن را تسخیر درآورد، وحکم نفاذ داد کہ سخن سنجان ایں ملک را در نظر بگذرانند بموجب حکم گذرانیدند۔ کلام نصرتی را بر ہمہ افضل فرمودہ بخطاب ملک الشعرائے ہند سرفرازی داد۔ تذکرہ فتوت

۳۔ "طفل اردو کا مکتب" کے عنوان میں اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ عمدۃ الملک کا گھر گویا طفل اردو کا مکتب تھا۔ جو دلائل اس کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ وہ ناکافی ہیں۔ زبانی روایات بیشک صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر تحقیقات کے لئے جب تک تحریری ثبوت نہ ہو کبھی دعویٰ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی محقق ان پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

نواب صاحب اکثر جگہ بلا دلیل کے بڑی بڑی اور اہم باتیں لکھ جاتے ہیں جن پر تعجب ہوتا ہے۔

اور پھر طفل اردو صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اردو کی حالت طفلی کی نہیں تھی۔ دکن میں وہ سن رُشد کو پہنچ چکی تھی۔ البتہ اردوئے معلّٰی لکھا جائے۔ تو صحیح ہو سکتا ہے۔

(۴) اسی عنوان کے تحت تحریر فرمایا گیا ہے :۔

"نادر کے قہر و غضب کی آگ بھی انہی عمدۃ الملک نے بجھائی . . . . . آخر عمدۃ الملک کمر کس کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے آئے۔ نادر نے پوچھا۔ خیر باشد محمد امیر چہ میخواہی، انہوں نے دست بستہ عرض کی :۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

یہ برجستہ و با موقع شعر سُنکر نادر نرم ہوا۔ تلوار میان میں کر کے کہا جیر بخشیدم"۔ ص ۵۴

پھر اس کے نوٹ میں حسب ذیل امر کی بھی صراحت کی گئی ہے :۔

"بعض ناواقفوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر آصف جاہ
نادر کے پاس گئے اور اس کے آتش غضب کو انہوں نے سرد
کیا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔"

اس بیان کے متعلق ہمارے دو اعتراض ہیں، اول تو یہ کہ جو دعویٰ نواب
صاحب نے کیا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت، اور ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔
گویا زبانی روایات کی بنا پر اس کو تحریر کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایسے بڑے
دعوے کے لئے ثبوت کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ محقق بلا ثبوت کبھی ایسا
دعوے کو قبول نہیں کر سکتا۔

دوسرے یہ کہ نفس حقیقت جو تاریخوں سے بخوبی ثابت ہے۔ اس کو
اپنی ذاتی خیال کے باعث غلط قرار دیا جا رہا ہے۔ جو کہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ
کہ نادر شاہ کے قتل عام کے وقت آصف جاہ نے پیش قدمی کی اور نادر شاہ
کے غصہ کو فرد کیا۔ عام اور مشہور واقعہ ہے جس پر مورخین نے صداقت کی مہر
ثبت کر دی ہے۔ قطع نظر دکنی مورخین کے ہم ایک شمالی مورخ ہی کے
الفاظ یہاں پیش کرتے ہیں:-

محمد علی خاں الانصاری [illegible] نے اپنی تاریخ مظفر شاہی میں جو [illegible]

میں تسنیف ہوئی ہے۔ لکھا ہے :۔

" نظام الملک فتح جنگ و اعتماد الدولہ قمر الدین خاں نصرت
جنگ سر برہنہ کردہ بزانو زدہ بہ الحاج تمام حکم اماں خواستند
نادر شاہ حکم اماں دادہ داخل قلعہ ارک شد۔"

ص ۲۸۷ مخطوطہ کتب خانہ آغا حیدر حسن

اس کے بعد نواب خیال کے دعوے کو جو بلا ثبوت ہے کس طرح
قبول کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ ولی دکھنی کے متعلق حسب ذیل خیال کا اظہار کیا گیا ہے :۔

" اور تو اور ہمارے تذکروں میں میاں ولی دکھنی اردو غزلوں کے
باوا آدم کہے جاتے ہیں اور کم نظری کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے
جاتے ہیں۔ مگر یہ ایک ولی کیا کسی ولی نے زبان کی یہ کرامت کبھی نہیں
دکھائی۔ حق یہ ہے۔ کہ ولی محمد شاہ کے شروع زمانہ میں اپنا دیوان بغل میں
دبائے کھوٹے کھرے کی شناخت کے لئے دکن سے دلی کے ٹکسال گھر
تک آئے اور اردو سیکھنے لگے۔" (ص ۵۹)

اس بیان کے پڑھنے کے بعد اردو ادب کے عناصر کے مطالعہ کرنے

والے حیران رہ جائیں گے۔ کہ نواب صاحب جیسے ادیب و محقق کے قلم سے کیسے غیر ذمہ دارانہ جملے نکل پڑتے ہیں چنانچہ اس کے متعلق ہمارے تین اعتراض ہیں :-

ا۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ کہ ولی نے محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی کا سفر کیا تھا۔ حالانکہ اس کا پہلا سفر ۱۱۱۲ھ میں عالمگیر کے زمانے میں ہوا۔ البتہ دوسرا سفر محمد شاہ کے زمانہ میں ہوا ہے۔

اس کی تصدیق اس عہد کے قلمی مخطوطوں سے ہوتی ہے۔ چنانچہ خود شمال کے متعدد تذکرہ نویس، قائم۔ میر حسن علی ابراہیم خاں۔ یوسف علی مرشد آبادی مرزا علی لطف اور عبدالغفور خاں نساخ کی تحریرات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

البتہ آزاد اور مؤلف گل رعنا محمد شاہ کے عہد کو ولی کا دہلی میں آنا قرار دیتے ہیں۔ آزاد کے خیالات کو خود نواب خیال متعدد جگہ ناقابل قبول قرار دے چکے ہیں۔

ب۔ ولی اپنا دیوان لے کر کھرے کھوٹے کی شناخت کے لئے دہلی آئے"۔

یہ بیان ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا۔ اول تو ولی اپنے سفر دہلی کے وقت دیوان مرتب کر چکے تھے اور اس کو ساتھ لائے تھے۔ پھر اس امر کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔ کہ دہلی میں اس نے اپنے کلام کی صحت کی اور موجودہ کلام صحت کردہ کلام ہے۔

دوسرے یہ کہ ولی کے سفر دہلی کے وقت کوئی شاعر اردوئے معلّٰی کا دہلی میں موجود ہی نہیں تھا جس کی تصدیق خود نواب صاحب کے بیان سے ہوتی ہے جب کسی شاعر کا وجود ہی نہیں تھا۔ تو پھر ولی اپنے کلام کے کھرے کھوٹے کی جانچ کس سے کر سکتے تھے۔

ج۔ نواب خیال کا خیال یہ ہے۔ کہ ولی دہلی میں اردو سیکھنے لگے۔ حالانکہ دہلی کے متقدمین شعرا کو بھی اس امر کا اعتراف تھا۔ کہ انہوں نے ولی سے استفادہ کیا ہے چنانچہ حضرت میر جو دہلی کے استاد سخن ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا۔

اس بارہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے اپنے مضمون "شاہ ظہور الدین حاتم" مطبوعہ "ہندوستانی" (الہ آباد) میں تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت

کیا ہے۔ کہ کس طرح حاتم اور ان کے ہمعصروں یعنی دہلی کے پہلے ابتدائی شاعروں نے ولی سے استفادہ کیا ہے اور اس کی پیروی پر فخر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ دعوے کرنا کہ ولی اردو سیکھنے دہلی آئے کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ ولی کے خدمات کا اعتراف نہ کرنا نہ صرف احسان فراموشی ہے۔ بلکہ ابطال حقیقت ہے۔

۶۔ بیان کیا گیا ہے۔ کہ "ولی بیچارے کو وہ زبان کہاں نصیب جو اردوئے معلّٰی کہی جائے اور قلعہ معلّٰی اور دہلی کے امرا کے محلوں سے بھی باہر نہیں نکلی تھی وہ تو وہی زبان بولتے تھے۔ جو اس وقت دکن میں رائج تھی اور نربدا کے ادھر ٹاپتی رہی۔"

اس سے نواب خیال کا یہ منشا ہے کہ اردوئے معلّٰی چونکہ مغل سلاطین کی پروردہ یافتہ تھی۔ اس لئے وہی فصیح ہے اور دکن کی زبان جو نربدا کے ادھر بولی جاتی تھی۔ غیر فصیح ہے۔

یہ امر خاص طور پر غور طلب ہے۔ کہ مغلوں کا تعلق ہندوستان کے ساتھ $\frac{1526}{932}$ سے ہوا اور پھر ہمایوں ایک مدت تک ہندوستان کے باہر رہا۔ عام طور سے دفتر کی زبان

شروع سے آخر تک فارسی رہی، بادشاہ اور امیروں کی زبان جو شاہی دربار میں بولی جاتی تھی۔ فارسی تھی۔ علما اور شعرا فارسی میں تصانیف کرتے تھے اردو گویا بازاری زبان تھی جس کو شاہجہاں (سنہ ۱۰۳۶ھ) کے زمانے سے مروج ہونے لگا اور اگرچہ اب وہ اردوئے معلّٰی سے موسوم ہوئی۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ سرکاری زبان نہیں ہوئی تھی۔ شعرا اور علما کی زبان نہیں تھی۔ اس کے باوجود بھی اس کو جو درجہ فصاحت کا دیا جا رہا ہے۔ وہ دکھنی کو نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ وہ یہاں سنہ ۱۴۰۰ء کے قبل سے مروج تھی، شاہی دفتر اسی زبان میں تھا۔ بادشاہی محلسراؤں امرا و رؤسا کی حویلیوں میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔ علما، اور شعرا اسی زبان میں اپنی تصانیف کرتے تھے۔ اس کے باوجود اس کو غیر فصیح کہا جاتا ہے۔

یہ کس قدر تعجب انگیز ہے۔ کہ جو زبان نہ تو شاہی دفتر کی زبان تھی اور نہ اس زمانہ میں اس کا کوئی شاعر نامآور ہوا ہے۔ مگر صرف قلعہ کی پرورش سے اس کو اعلیٰ درجہ دیا جا رہا ہے اور اس کے مقابل اس زبان کی تحقیر کی جا رہی ہے۔ جو صدیوں گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاہی درباروں کی زینت بنی رہی سینکڑوں باکمال شاعر اپنے کلام سے چمنستان اردو کو گلزار بنا چکے

تھے، بیسیوں ادیب اپنے تصانیف سے گلشنِ اردو میں سدا بہار پھول کھلا چکے تھے، اس کے باوجود اس کو کوئی درجہ نہیں دیا جاتا - بلکہ اس کی تحقیر کی جاتی ہے !

(۷) تو آب خیال اس امر کو قبول کرتے ہیں - کہ اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی کی کربل کتھا ہے - جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی تھی - چنانچہ بیان کرتے ہیں :-

"محمد شاہ کا اردو پرست زمانہ اس زبان کی پہلی نثر کے لئے بھی ممتاز اور یادگار رہیگا - فضلی نے اسی بادشاہ کے عہد (۱۱۴۵ھ) میں کربل کتھا لکھکر نثر اردو کی بنیاد ڈالی اور اپنے اخلاف کے لئے ایک شاہراہ کھول دی۔"

اور پھر آگے چل کر لکھا گیا ہے :-

"اس ملک میں جب انہوں نے (مسلمانوں) اپنی مذہبی آواز پھیلانی چاہی - تو نظم ہی کو اپنا آلہ بنایا . . . . . نثر کا پرچہ سننے میں نہیں آیا۔"

غرض کہ نواب خیال کربل کتھا کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ادبی کتاب بھی نہیں ہے -

بیشک یہ صحیح ہے۔ کہ شمالی ہند کے لیے باغ و بہار اردوئے معلّٰی کے لیے یہ نثر کی پہلی کتاب ہے۔ مگر اس کو زبان اردو کی پہلی نثر قرار دینا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سراسر غلطی ہے۔ کیونکہ اس سے ایک صدی پہلے ۱۰۴۵ھ کی اردو زبان کی ادبی کتاب سب رس موجود ہے جو اب چھپ چکی ہے اور دو صدی قبل مذہبی کتابیں نثر میں لکھی گئی ہیں۔ ان تمام کے باوجود کربل کتھا کو نثر اردو کی پہلی کتاب قرار دینا زیادتی ہے۔ جو حق بجانب نہیں ہو سکتی۔

(۸) مولانا آزاد پر جا بجا سخت ریمارک کئے گئے ہیں۔ مثلاً:-

"آزاد مرحوم کی روح نہ شرمائے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی انشاء پردازی کی دھن میں آنکھیں بند کر لیتے اور اپنے قلم کو آزاد کر دیتے ہیں۔" (ص ۹۱)

مولانا آزاد نے جس وقت اپنی تالیف "آب حیات" مرتب فرمائی اس وقت کے معلومات کے لحاظ سے وہ اچھی اور بہت اچھی کتاب تھی۔ ادب ریاضی نہیں۔ کہ اس کا ہر مسئلہ یقینی ہو جائے، جدید تحقیقات سے جب معلومات ہونے جاتے ہیں۔ تو سابقہ نظریے بدل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کو اپنے پیشرو مصنفین پر سخت حملے نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ زمانہ آیندہ میں جدید نسل سے ہم کو

بھی اسی کی توقع رکھنی چاہیئے ۔

(۹) "مغل اور اردو" میں ماخذ کے حوالے بہت کم بلکہ شاذ دیئے گئے ہیں جب تک ماخذوں کے حوالے نہ دیئے جائیں ۔ کوئی محقق کسی دعوے کو قبول نہیں کرسکتا ۔ اس لئے یہ بہت بڑی خامی ہے ۔

ماخذوں کے حوالے نہ ہونے اور زبانی روایات کو اہمیت دیئے جانے کے باعث ہمیں خوف ہے ۔ کہ کہیں کوئی محقق "داستان اردو" کو اہم تاریخی قرار دے کر داستان ہی نہ قرار دے جس میں صدق و کذب لازمی اور ضروری ہے ۔

ہمیں امید ہے ۔ کہ جب اصل "داستانِ اردو" شائع ہوگی ۔ تو ان خامیوں کو دور کر دیا جائے گا ۔

شاہجہاں دہلی سنہ ۱۹۳۳ء

جواہرِ سخن پر ایک نظر

اب تک شعرائے اردو کے بیسیوں دیوان اور کلیات شائع ہو چکے ہیں اور مدارس کے نصاب میں بعض شعراء کے کلام کا مختصر انتخاب بھی شامل ہے۔ مگر کل شعرائے اردو کے کلام کا کوئی قابلِ لحاظ مجموعہ شائع نہ ہوا تھا۔ چند سال سے اس قسم کے مجموعے شائع کرنے پر بعض اصحاب نے توجہ کی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے سر مسعود جنگ مرحوم نے "انتخابِ زریں" کے نام سے شمالی ہند کے بعض شعراء کے کلام کا ایک انتخاب شائع فرمایا۔ اس کے علاوہ مولانا الیاس برنی صاحب نے مختلف عنوانات کے تحت ایسے مجموعے شائع کئے اور خوب مقبول ہوئے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کے کارپردازوں نے اعلان کیا تھا کہ ... اردو شہ پاروں کے نام سے تین جلدیں شائع کریں گے۔ پہلی جلد اردو شاعری کے آغاز سے دلی کے زمانہ تک ہوگی۔ دوسری جلد ولی سے غالب کے عہد پر مشتمل ہوگی۔ اور تیسری جلد غالب سے موجودہ عہد تک ہوگی۔ اس سلسلہ کی صرف پہلی جلد جس کو ڈاکٹر سید محی الدین زور نے مرتب کیا تھا، شائع ہوئی

حصہ اول دکنی شعراء سے مختص ہے۔ اس میں بھی گویا تین فصل ہیں پہلی فصل شعرا گولکنڈہ اور بیجاپور پر مشتمل ہے۔ جس میں صرف اکیس شعرا کا ذکر ہے پہلا شاعر وجہی ہے۔ دوسری فصل احاطہ مدراس اور بیجاپور کے عنوان سے ہے اس میں گیارہ شعرا کا کلام ہے۔ پھر شعرا اورنگ آباد کے تحت سولہ شعرا کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حصہ دوم شعرا دہلی کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں اتالیس شعرا کا انتخاب ہے۔

انتخاب میں مثنوی قصیدہ۔ رباعی، غزل سب کچھ شامل ہے۔ اس طرح بہ حیثیت مجموعی جواہر سخن اسم با مسمیٰ ہے۔

ہماری رائے میں اس میں مختلف قسم کی فروگذاشتیں ہوئی ہیں جن کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ ان کا ذکر حسب ذیل ہے۔

۱۔ شعرا کے حالات میں مختلف قسم کی فروگذاشتیں ہوئی ہیں مثلاً آگاہ کے حالات میں بتایا گیا ہے۔ کہ ان کی صرف دو اردو تصانیف ہیں ہشت بہشت اور من درپن (صفحہ ۸۶) یہ بیان صحیح نہیں ہے۔

من درپن درحقیقت ہشت بہشت کا ہی ایک باب ہے کیونکہ ہشت بہشت آٹھ بابوں کا مجموعہ ہے جن کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ مولانا باقر آگاہ کی اردو

تصانیف کی تعداد (۱۶) ہے جن کے ناموں کی یہاں صراحت کی جاتی ہے،
(۱) ہشت بہشت (۲) ریاض الجنان (۳) تحفہ احباب (۴) محبوب القلوب (۵)
تحفۃ النسا (۶) فوائد و عقائد (۷) روضۃ السلام (۸) خمسہ متحیرہ (۹) ہدایت نامہ
(۱۰) ریاض السیر (۱۱) معراج نامہ (۱۲) فرقہ ہائے اسلام (۱۳) رسالہ عقائد (۱۴) مثنوی
روپ سنگار (۱۵) مثنوی گلزار [illegible] (۱۶) کلیات [illegible] لیکن [illegible]
منظوم ہیں مصنف کے زور کلام کا پتہ ان کے کلیات [illegible] مثنوی [illegible]
[illegible] میں سے کسی کا ذکر [illegible] ہے۔

[illegible]

کا نام [illegible] ہے [illegible] وفات [illegible] میں [illegible]
دی جا سکتی کیونکہ سب بیان [illegible] میں [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] میں [illegible]
ہیں کی ہے۔

[illegible]

تخلص نھا۔

ج ۔ ماخذوں کے حوالے اگرچہ اکثر مقامات پر دیے گئے ہیں ۔ بلکہ یہ اہتمام کیا گیا ہے ۔ کہ ہر شاعر کے حالات اور اس کے کلام کے متعلق حوالہ دیا جائے مگر اس کے باوجود دکھنی شعرا اور ان کے کلام کے متعلق بیسیوں جگہ ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں ہے ۔ مثلاً ا کلام غواصی ص۷۴ جنیدی معہ کلام ص۴۹ کلام ابن نشاطی ص۷۴ ۵ کلام فائز ص۵۵ شاہی ص۵۶ ہاشمی ص۶۴و۶۵ عاجز ص۶۵ بحری ص۶۷، ۶۸ ؛ یمین ص۷۵ وجدی ص۸۸ داود ص۱۶۳، ۱۶۶ ۔ کلام سراج ص۱۷۳ عزیز ص۱۷۶ احمدی ۱۷۷ ، مرزا ص۱۷۸ امین ص۱۷۹، ۱۸۰ افضلی ص۱۸۱ امنور الدولہ ص۱۸۲ وغیرہم ۔

د ۔ جیسا کہ کتاب پڑھنے سے واضح ہے ۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں دکھنی شعرا کا ذکر ہے جس میں ابتدائی شعرا یعنی عہد قطب شاہی اور عادل شاہی کے علاوہ عہد آصفیہ اور احاطہ اور مدراس وغیرہ کے شعرا بھی شامل ہیں ۔ مگر ان کی تعداد ان کی حقیقی تعداد سے نہایت کم ہے ۔ ایسے شعرا جو اپنے کلام کے لحاظ سے استاد سخن کہے جاسکتے ہیں ۔ اور جن کی تصانیف ان کی قابلیت کی بین دلیل ہے بیسیوں ہیں ۔ چنانچہ صرف عہد قطب شاہی اور عادل شاہی کے شعرا جن کا ذکر جواہر سخن میں ہو سکتا تھا بطور مثال حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ احمد	قطب شاہی	مثنوی لیلیٰ مجنوں
۲۔ امین	″	قصہ ابو شحمہ
۳۔ غلام علی	″	مثنوی پدماوت
۴۔ لطیف	″	ظفرنامہ
۵۔ افضل	″	محی الدین نامہ
۶۔ علی	عادل شاہ (شاہی)	کلیات
۷۔ مقیمی	عادل شاہی	چندربدن و مہیار
۸۔ دولت	″	بہرام و حسن بانو
۹۔ ملک خوشنود	″	ہشت بہشت
۱۰۔ رستمی	″	خاورنامہ
۱۱۔ مرزا	″	مراثی
۱۲۔ شاہ ملک	″	احکام الصلوٰۃ

ان میں سے اکثر مثنویاں اپنی خصوصیات کے باعث نہایت اہم ہیں اور ان کے مصنف استادِ سخن کہے جا سکتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ دکن کے شعرا کے متعلق معلومات کی وسعت بہت تنگ تھی

اور ان کے متعلق ہماری نظر کی جولاں گاہ دور رس نہیں تھی۔ اور ان کے کارنامے
ہماری نظروں سے پنہاں تھے۔

مگر اب وہ بات باقی نہیں رہی۔ کتنی کتابیں اور مضامین ان کے متعلق
شائع ہو چکے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان سے معقول استفادہ کیا جاتا۔ مولف
جواہر سخن اور ارباب اکیڈیمی سے ہمیں امید ہے۔ کہ آئندہ کتاب کی جلدوں
میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ بلکہ ایک ضمیمہ کے طور پر بھی تبصرہ کا تکملہ کر دیا
جائے۔ تو مناسب ہے۔ تاکہ یہ شعر کے جواہر پوشیدہ نہ رہیں فقط۔

(شاہ جہاں [illegible])

شعرائے اردو کا ایک نایاب تذکرہ

ایک زمانہ وہ تھا۔ کہ قدیم شعرائے اردو کے تذکرے نایاب اور کمیاب
تھے۔ مگر اب متعدد تذکرے طبع ہو چکے ہیں۔ ان میں میر تقی کا تذکرہ نکات
الشعرا، اور قائم کا تذکرہ "مخزن نکات" شمالی ہند کے قدیم ترین تذکرے ہیں
ہنوز متعدد تذکرے ایسے ہیں جن کے مخطوطات تو موجود ہیں۔ مگر وہ
اب تک طبع نہیں ہوئے۔ مثلاً تذکرہ فتح علی گردیزی، علی ابراہیم خان کا

تذکرۂ گلزار ابراہیم" اور تذکرۂ مصحفی وغیرہ۔ ان سے قطع نظر دکن کے مرتبہ تذکرے بھی نایاب تھے۔ جن میں سے چھپی نارائن شفیق کا تذکرہ "چمنستان شعرا"[1] اور خواجہ خاں حمید کا تذکرہ "گلشن گفتار" شائع ہوا ہے۔

شمالی ہند کے تذکروں میں دکھنی شعرا کا حال بہت کم پایا جاتا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے۔ کہ دکھنی شعرا کے متعلق ان کو پوری طرح معلومات حاصل نہیں ہوئے تھے۔ جو معلومات تھے۔ وہ زیادہ تر سید عبدالولی عزلت کے سفر دہلی کے بعد ان سے اخذ کئے گئے تھے۔ اس کے برخلاف دکھنی تذکروں میں شمالی ہند کے شعرا کا حال تفصیل سے نظر آئے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کے معلومات کا ذریعہ وسیع تھا۔

دکن اور شمالی ہند کے تذکروں میں چند امور مشترک نظر آتے ہیں۔ جو ان ابتدائی تذکروں میں عموماً پائے جاتے ہیں:۔

۱۔ چونکہ شعرائے اردو کی تذکرہ نویسی بھی فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی ترتیب بھی فارسی تذکروں کے مماثل ہوتی تھی اور یہ اثر اس قدر غالب تھا۔ کہ اردو شعر کہنے والوں کے تذکرے ہونے کے باوجود فارسی میں لکھے جاتے تھے۔

---

[1] یہ سب اب شائع ہو چکے ہیں (حاشی)

ب۔ یہ قدیم تذکرے عموماً شاعر کے تخلص کے لحاظ سے ردیف دار لکھے جاتے تھے۔ قائم نے البتہ دور قائم کئے ہیں، جس کی پیروی مولانا محمد حسین آزاد نے کی ہے۔

ج۔ شاعر کے حالات کی تفصیل نہیں ہوتی اور نہ اس کی پیدائش اور مرنے کا سنہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اکثروں کے ساتھ ان کے وطن کی بھی صراحت نہیں ہوتی۔

د۔ مصنف کو جن شاعروں سے کوئی خصوصیت ہوتی ہے۔ ان کے کلام کی مبالغہ آمیز تعریف کی جاتی ہے۔

اب تک دکن کے جن غیر مطبوعہ قدیم تذکروں کا پتہ چلا ہے۔ وہ دو ہیں:-

۱۔ ریاض حسنی مصنفہ عنایت اللہ فتوت جو ۱۱۶۸ھ ہجری میں مرتب ہوا۔

۲۔ تذکرہ تمنا جو ۱۱۹۴ ہجری میں مرتب ہوا۔

اس مضمون میں فتوت کے تذکرے "ریاض حسنی" کا تعارف مقصود ہے اس کا ایک مخطوطہ دفتر دیوانی و مال سرکار آصفیہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس تذکرے کے (۲۲۳) صفحے ہیں، بارہ سطری سطر ہے۔ کاتب خود

سیدنا عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ ان کے اجداد بدخشاں کے رہنے
والے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد اودگھ کے قریب رجرا آج کل
"چاندا" سے موسوم ہے، ایک موضع میں اقامت کی۔ یہاں ان کے
بزرگ کسی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ نتوت کے دادا خواجہ آفتاب "خجستہ
بنیاد" (یعنی اورنگ آباد) آئے جہاں ان کے بعض دوسرے رشتہ دار
بھی مقیم تھے۔ نتوت کے باپ حضرت خواجہ عبدالرحمٰن سرکار آصفیہ کے سلک
ملازمت میں داخل ہو کر اعلیٰ مراتب اور خطاب "اعتقاد الدولہ لشکر جنگ" سے
سرفراز ہوئے۔ جاگیر اور منصب سے ممتاز کئے گئے۔ جوانی میں ان کو موسیقی
سے خاص دلچسپی تھی۔ ہر دو شنبے کو موسیقی کا جلسہ کرتے جس میں ماہران فن
جمع ہوتے اور اپنے اپنے کمالات دکھاتے۔ کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہا
کرتے تھے۔ شجاع، دلاور، صاحب مروت و سخاوت تھے۔ ۱۱۶۰ھ
میں ان کا انتقال ہوا۔

نتوت کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ سنہ پیدائش سے ہم واقف
نہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر کچھ زیادہ
نہ تھی۔ حضرت سید محمد حسینی سے (جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اولاد سے

تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کا اکتساب کیا۔ کم عمری سے شاعری کا شوق تھا۔
مشاعروں میں شریک ہوتے۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔
اس زمانے میں اورنگ آباد میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ مشہور مشہور
شعرا اورنگ آباد میں جمع تھے۔ بزم شعرا کے صدر سید سراج الدین حسینی
"سراج" جیسے استاد فن تھے۔ نفوت بھی ان کے شاگردوں اور ارادتمندوں
میں تھے۔ ان کے فرزند درویش محمد سے نفوت کو بڑا اتحاد تھا۔ باپ کے
مرنے پر نفوت کا تعلق دربار آصفی سے قائم ہوگیا۔ ۱۱۷۶ھ میں آبائی
جاگیر ان کو اور ان کے بھائی خواجہ ابوالبرکات خاں کو ملی۔ اور دونوں خطاب
خانی و بہادری سے سرفراز کئے گئے۔ محرم ۱۲۲۳ھ میں نفوت کا انتقال
ہوا۔ اولاد غالباً کوئی نہ تھی۔

اس تذکرے کی وجہ تالیف کے متعلق دیباچے سے معلوم ہوتا ہے۔
کہ مؤلف کے ایک دوست خواجہ محمد اکرم کو شعرا سے بڑا خلوص تھا۔ ان کی
دوستی کا دائرہ نہ صرف اورنگ آباد یا دکن ہی کے شعرا تک محدود تھا۔ بلکہ
شمالی ہند کے نامور شعرا سے بھی روابط قائم تھے اور اکثروں سے نامہ و پیغام
کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے پاس شعرائے متقدمین و متاخرین کے کلام کا بڑا

۱۔ اس میں شمالی ہند کے ایسے متعدد شعرا کا ذکر اور کلام ہے جن کے متعلق میر تقی، قائم اور میر حسن کے تذکرے ساکت ہیں۔ اور وہ شعرا یہ ہیں :۔

۱۔ آزاد محمد فاضل دہلوی

۲۔ آگاہ، محمد صلاح دہلوی

۳۔ آشنا۔ زین العابدین دہلوی

۴۔ آوارہ، محمد کاظم دہلوی

۵۔ الہام۔ فضائل بیگ دہلوی

۶۔ انجام، امیر خان دہلوی

۷۔ ارشد، شیخ محی الدین اُجینی

۸۔ حیرت، اسمٰعیل خان دہلوی۔

۹۔ حیا دہلوی۔

۱۰۔ ذہین، میر محمد مستعد دہلوی۔

۱۱۔ ضائع، بلگرامی

۱۲۔ طالع، میر شمس الدین دہلوی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میخانے بیچ جا کر شیشے تمام توڑے　　زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

آبرو { بلند استعداد خوش گو شیخ مبارک اللہ آبرو گوالیری است۔
علم سخن بدار الخلافت شاہجہان آباد بہ پیشانی حشمت نشان
سخن دانی افراشتہ کوس معانی را بآواز دل نواز می نوازد۔

کرتے تو ہو تغافل پر حال آبرو کا
دیکھو تو تم پیارے بے اختیار رو دو

مجلس زنداں میں مت لیجا دل بے شوق کو
شیشۂ خالی کو کیا عزت ہے میخواراں کے بیچ

دل تو دیکھو آدم بے باک کا
عشق سے بھرتا ہے پتلا خاک کا

بیدل { از احوالش کماہی آگہی نیست
مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل جہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل جہاں ہے ہم ہیں

حاتم } محمد حاتم حاتم شاعر خوش بیان و عندلیب رنگین الحان۔ زادہ درویش۔ فرحت نژاد۔ جہاں آباد خدمت سخن را چنیں

امتیازی دہر۔

آب حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

ساقی شراب ناب ہے اور سب ہیں یار جمع
آنے کا کر رہے ہیں ترا انتظار جمع

کوئی ہے سرخ پوش کوئی زرد پوش ہے
آ دیکھ بزم میں کہ ہوئی ہے بہار جمع

جو بال زلف کا ترے شانے کے ہاتھ سے
ٹوٹا سو ہم کیا ہے اُسے تار تار جمع

چمن چمن کھلے ہے کوئی ایسا بھی دردمند۔
مدت ستی ہوئے ہیں پھپھولوں میں خار جمع

آ جا کہے ہے تجھ ستی حاتم یہ وقت ہے
ہوتے ہیں پھر یہ یار کہاں بار بار جمع

مظہر

مرزا جان جاناں مظہر. گوہر اصلش از دیار بخارا و مولد و منشائش اکبرآباد. متانت فکرش مظہر تجلیات الٰہی است و مظہر انوار فیوضات غیر متناہی میگویند کہ بلند ہمتی بہ شعر و شاعری سر فرو نمی آرد و این فن را سرمایۂ افتخار نمی انگارد۔ اکثر اوقات گرامی خود را در تکرار حدیث مصروف میدارد و از سیر و تواریخ سلف بہرہ متکاثر حاصل می نماید. ازانجا کہ آب و گلش تخمیر یافتہ سخن است عنان اشہب فکر را در ساخت فصاحت این فن میگرداند. غرض امام الشعرائے عصر خود است. منصفان سینہ صاف افصح المتاخرین میگویند۔ در ثنا و مدحش لب بر چشم می پویند۔

گئے آخر جلا کر گل کے ہاتوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

نہ جانوں صبحدم باد صبا کیا جا پکار آئی
کہ غنچے کا دل نازک چمن کے بیچ بہار آئی

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں
بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

میر } والا فکر بے نظیر میر محمد تقی میر. زاد گاہش اکبرآباد است
فکرش رنگیں ایجاد مصباح طبعش برگردئے (؟) تجلی کن ادراک
سراج الدین علی خان آرزو است رسا طبع والا فکر است ۔

بھلا تم نقد دل لے کر ہمیں دشمن کہو اب تو
کہو کچھ ہم بھی کریں گے حساب دوستاں در دل

ممنون } ممنون از شعرائے دار الخلافت شاہجہان آباد
است ۔

کبھی بلبل نے پنجرے میں ہوا قسمت کا یوں پایا
کہ خار.. وصل گل ہوا اور ہم سوک کر کانٹا

(ب)۔ دکھن کے شعرا:۔

آصف } عمدۂ امرائے عظیم الشان قدوۂ خوانین بلند مکان رکن رکین
سلطنت عمدۂ عمید خلافت، صاحب سیف و القلم،
رافع لوائے و العلم وزیر صاحب تدبیر سپہ سالار با فرہنگ نظام الملک

بهادر فتح جنگ استفادهٔ سخن از انادنگاه مرزا عبد القادر بیدل جنت منزل است دیوانها مدون دارد و در تمام عمر خود که ہمیں مضمون ہندی تسخیر خاطر گردیده و بحسب اتفاق بلسان در بیان سرزده۔ المتخلص آصف و شاکر۔

کالی نہ کہو کوئی میرے دلبر کون حسد سے
مجھ دل کی کلی میں یہ دعائے یمینی ہے

امامی } مہرکند دار السرور برہان پور است مرثیہ ہا میگوید و بر بیل مدح حضرت امام شہید علیہ السلام می پوید و حب آل عبا در دلہائے محبان می افزاید۔

آب بن جب ہوئے تسلیم لب یاقوت حسین
جام کوثر کا دیا حور نے اس آن میں آ

حمید } سید خواجہ خان حمید پسر بزرگ ترک تازخان بہادر قومی جنگ است مشق سخن از عارف الدین خان عاجز نمود۔ مہارت بعلم موسیقی بقانون در چنگ است کار زندگی در عین عنفوان از دائرہ

حیات گسیختہ بمقام ریختہ گوئی رابایں نو(؟)، در پردۂ نازک خیالی جلوہ میداد۔

مجھ کو دیتا ہے نگاہوں سیں وہ بالا بالا
جس سے پلکوں نے ہر یک موسے سنبھالا جا۔

دردمند { محمد فقیہہ دردمند خوش طبعش از آئینہ مانی مرزا مظہر گردید مولدا و از دیگر از توابع محمد آباد بیدر است. کہ در صغر

سن ہمراہ والد خود از دکن بشاہجہان آباد رفت و در ظل عاطفت شاہ ولی اللہ اشتیاق نبیرۂ مجدد سرہندی قدس سرہ جا گرفت بعد چندے مرزا مظہر جان جاناں بتربیت او پرداخت و بہ یمن نظر رحمت او کمالات فراہم آوردہ شعر فارسی و ریختہ شائستہ در سلک نظم می کشید۔ ساقی نامۂ او شہرتی دارد۔ مدتیست کہ بجانب بنگالہ رفت و آنجا بجمعیت روزگار بسر می برد۔ از خامہ او سخن چنیں می تراود۔

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد
اس دہر کے جاتے ہیں سبھی عیش بہ باد

پرویز کنیں شیشہ خانہ عشرت پر (۹)
سنگ آیا ولیک سخت آیا فرہاد

سعدی۔ سعدی کہنی کہ بر احوالش کماہی آگاہی دست نداد۔

ہمنا تمن کو دل دیا تمن لیا اور دکہ دیا

تم یہ کیا ہم دہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

سراج } سراج بہ انجمن محفل قدسی اساسیان بدر منیر آسمان شب زندہ دارانِ دخلص معنی سراجاً منیرا۔ ۔ ۔ ۔ حضرت شاہ سراج الدین حسینی سراج از سادات حسینی صحیح النسب است۔ بجانب قدوۃ سالکان حضرت شاہ عبدالرحمٰن قدس سرہ دست بیعت دادند و بکمال توکل و استغنا بدریافت معنی من یتوکل علی اللہ فہو حسبہ اوقات ملکوتی صفات خود در خجستہ بنیاد حق میگذارد و در مبادی نشو و نما برنگ گل خرقۂ درویش در بر کردہ بہ تباشیر صبح شعور لسان بلبل زمزمۂ سخن سنجی پیش گرفتہ مرتبۂ سخن گوئی از شان صفات او مرتبہ ادنیٰ است و اعجاز معجزات کلام از سیلی پیام و ہویدا صاحب کمالات سنخنان ہند و دکن افضل المتاخرین میگویند و در میدان صفش بسر چشم می پویند :۔

دل نہیں ہے بلکہ ہے سولی کا پھول دوسرا منصور کہلانے لگا۔

سراج اس ہستی موہوم کا احوال کہنے کو   عدم کے صاف تختے کشودہ تنا مدتے ہیں

ہے طریق خاکساری میں مرا دل ان دنوں   خاک بردار غبار رہگذر انتظار

ناصر } درۃ التاج اورنگ نشینان جہان تبول سنت شاہ شہیدان . . . خلف الصدق حضرت آصف جاہ امیر الممالک برضا

حق رسی درسا بر نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ناصر رئیس ملک دکن بود ذائقہ

حیاتش شربت شہادت چشید و بعنایت الٰہی در سلک کمترین بندہ ہائے

مظلومان دشت کربلا کردید۔

نین تیرے شکار کرتے ہیں   دل ہمارا فگار کرتے ہیں

خوب رو جب سنگار کرتے ہیں   آرسی پر بہار کرتے ہیں

کس کی بیداد سوں چمن میں آج   بلبل نالے پکار کرتے ہیں

اہل دل گریۂ ندامت سیں   سیر ابر بہار کرتے ہیں

خوش نگہ بہن بریں سبز لباس   سرو کو شرمسار کرتے ہیں

چشم بد دور دلبراں ساری   اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں

نصرتی } سخن طراز دکن است مسکنش بیجاپور، اکثر قصہ ہا و دیوان ؛ بزبان ہندی مرتب ساختہ و در آن مدحش ہا بسیار کردہ۔

داد معنی یابی داد۔ وقتیکہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی انار اللہ برہانہ ولایت
دکن را در تسخیر در آورد و حکم نفاذ داد کہ سخن سنجان این ملک را در نظر
بگذارند، بموجب حکم گذرانیدند۔ کلام نصرتی را برہمہ افضل فرمودہ بخطاب
"ملک الشعرائے ہند" سرفرازی یافت۔ چنانچہ در مدح عاشق شہباز بلند پرواز
سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بکمال خشوع و خضوع می سراید:۔

کہ جب اصل سینی سیادت کی بیل
چلی بن سین ہستی کے جب باند جبیل ؟
کمالت کا جب آکے منڈا چھڑی
لگا گل سو یوں پائے عزت بڑی
دکن کی عجب بخت ور خاک ہے
کہ جس بیچ تجھ خواب گاہ پاک ہے
زبان وھو کے پھول نرسوں کل ہیں لاؤں ؟
کہ سید محمد حسینی کا ناؤں

ولی } مظہر کمالات خفی و جلی محمد ولی دکھنی۔ زاد و بودش دکن است
و دست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ

دارد - موجد ریخته گوئی و بانی بنائے فصاحت زبان هندوی است . و در فن ریخته گوئی امام الشعرا است . مدتے در بلدهٔ گجرات عافیت صفات چهرهٔ هستی فروخته آخر الامر از صورت جهان بے بنیاد گذشته و گذاشته ؟ [illegible] شانه الله تعالی مغفرت نماید - این چنین اشعار از کلام معجز [illegible]

است :-

نہ پوچھو عشق میں جوش و خروش دل کی ماہیت

برنگ ابر دریا بار ہے رو مال عاشق کا

غرور حسن نے تجھ کو کیا ہے اس قدر سرکش

کہ خاطر میں نہ لاوے توں اگر تجھ گھر پری آوے

یکرنگ - شاعر یکرنگ . بود و باشش بجمشن بنیاد فرخنده بنیاد است . در سخن فرمن فکرش برجسته داشت و در بدیهه گفتن خود را یگانه عنصری انگاشت . گاهی تتبع فکرش بطرف زبان دکن مائل می شود :-

نا دے کجل سجن یو انکھیاں اب ہری کے تئیں

سادی تیں یہ بس ہیں تری دو دو نین

نا پیچ دے زلف کو نہ کر ابرواں کو خم

کافی ہے یک نگہ تری افسوس گری کتئیں

ناگر، لباس زر کا توں لے من موہن پیا

. . . .

(رسالہ ہندوستانی اکتوبر ۱۹۳۳ء)

تمنا کا تذکرۂ شعرا

تاریخ ادب اردو کے لئے تذکرہ کی اہمیت کو سب ارباب ادب نے تسلیم کیا ہے لیکن اس کی اہمیت کے احساس کے باوجود قدیم تذکروں کو طباعت کا جامہ پہنانے پر اب تک جیسی چاہیئے ویسی توجہ نہیں ہوئی ہے جس طرح دکن کی شاعری کو شمالی ہند کی شاعری پر اولیت کا تفوق حاصل ہے، اسی طرح تذکرہ کی کتابوں کی تالیف میں بھی دکن کو اولیت کا فخر حاصل ہے، دکن میں مرتب شدہ تذکرے شمالی ہند کے تذکروں سے قدیم ہیں، چنانچہ اب تک قدیم دکھنی تذکروں میں سے (۱) تذکرۂ حمید دگلشن

گلستار مرتبہ ۱۱۶۴ھ) (۲) تذکرہ افضل (تحفۃ الشعرا مرتبہ ۱۱۶۵ھ) (۳) تذکرہ نتوت در ریاض حسنی مرتبہ ۱۱۶۸ھ) اور (۴) تذکرہ شفیق (چمنستان شعرا مرتبہ ۱۱۷۵ھ) کا پتہ چل چکا ہے۔

اس کے پہلے ہم ریاض حسنی یعنی تذکرہ نتوت کو رسالہ ہندوستانی بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں روشناس کرا چکے ہیں، اس وقت دکن کے ایک اور تذکرہ کا تعارف کرایا جاتا ہے، یہ تذکرہ ۱۱۹۴ھ میں "تالیف پایا ہے۔

کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) میں ایک مخطوطہ موجود ہے جس کو تذکرہ تمنا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخطوطہ کے (۱۴۴) صفحے اور ہر صفحہ میں (۱۹) سطریں ہیں، خط نستعلیق ہے، تاریخ کتابت درج نہیں، اس کے بجائے تذکرہ کے شروع ہونے اور ختم ہونے کی تاریخیں درج ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ تذکرہ تمنا نے تالیف کیا ہے اور ۱۱۹۲ھ میں اس کی تالیف شروع ہوئی اور دو سال بعد ۱۱۹۴ھ میں اس کی تالیف ختم ہوئی۔

وہ قطعات حسب ذیل ہے:۔

چو ایں تذکرہ را نمودم شروع   ز حق است امید اتمام او

تمنا بتاریخ سال اش زمن "خرد گفت" آغاز صحیفۂ بحو ۱۱۹۲ھ

تذکرۂ شاعران شد چو تمام این زمان — دل و جان حزین بہیج و شادمان

داشت تمنا دلم فکر بتاریخ او — آمده آواز غیب شکر خدائے جہان ۱۱۹۲ھ

اس کتاب میں حروف تہجی کے لحاظ سے شعرا کا ذکر ہے اور ہر شاعر کے فارسی کلام کے بعد اس کا اردو کلام درج کیا گیا ہے، اس امر کے قوی قرائن موجود ہیں، کہ یہ نسخہ خود مؤلف کا مسودہ ہے۔

سارے مخطوطہ میں جا بجا حک و اصلاح موجود ہے اور نیز اضافہ اور عبارت کے بڑھانے کا جو ڈھنگ ہے، وہ سوا مؤلف کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ جا بجا متعدد صفحات خالی چھوڑ دیئے گئے ہیں، اس سے بھی ہمارے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

اس تذکرہ سے اس کے مؤلف کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا تخلص "تمنا" تھا، وہ اورنگ آباد کا باشندہ اور حیدرآباد کا متوطن تھا۔ دربار آصفی کے امرا تک رسائی حاصل تھی، صمصام الملک کا درباری شاعر تھا۔ ارباب کمال سے ربط و ضبط رکھتا تھا۔ اس سے بعض شاگردوں نے بھی اس کے زمانہ میں

شہرت حاصل کرلی تھی، اور اس تذکرہ کی تالیف اپنے دوست محمد کرم بخش سالم قاضی پیپری کے کہنے سے کی ہے، اس کتاب کے تالیف کے وقت تمنا کے والد بھی زندہ تھے لہ۔

دکن کے جن تذکروں سے ہم واقف ہیں، ان میں کسی تمنا کا ذکر نہیں ہے، مگر مجموعۂ فصاحت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں ایک شاعر اسد علی خان تمنا تھے، جو ارسطو جاہ کی خدمت میں قصائد اور قطعات پیش کیا کرتے تھے اور یہ قطعات ۱۱۹۷ھ سے ۱۲۰۳ھ کے زمانے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مخطوطہ پر بھی کسی نے پنسل سے اسد علی خان تمنا کا نام لکھ دیا ہے۔ اور خود بعض شعرا کے حالات میں تمنا نے اپنے تخلص کے ساتھ اس تذکرہ کے مؤلف ہونے کی صراحت بھی کی ہے۔

افسوس ہے کہ دیگر تاریخی حوالوں سے ان کے حالات پر روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ اس امر کا پتہ چلتا ہے۔ کہ اعلیٰحضرت آصف جاہ ثانی کی پیش گاہ میں اسد علی خان تمنا نے قصیدے پیش کئے ہیں، بہرحال اس امر میں کوئی شک و شبہ

لہ تمنا کا دیوان نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے جس کا اب پتہ چلتا ہے۔
لہ ارسطو جاہ کی مدح میں جو قصائد اور قطعات لکھے گئے تھے۔ ان کو ایک مجموعہ میں جمع کیا گیا ہے اور جس کو مجموعۂ فصاحت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ سرکار عالی کے دفتر دیوانی و مال کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

نہیں ہے۔ کہ اسد علی خان تمنا دکن کے ایک صاحب مرتبت شاعر تھے اور یہ تذکرہ انہی کی تالیف ہے۔

افسوس ہے کہ ہم تمنا کے سنہ وفات سے بھی واقف نہیں ہیں۔ مگر مجموعہ فصاحت کی تالیف کا زمانہ ۱۲۱۵ھ ہے، اس میں تمنا کے جو قطعات شامل کئے گئے ہیں، ان میں ۱۲۰۴ھ کے بعد کا کوئی قطعہ شامل نہیں ہے۔ درآں حالیکہ ۱۱۹۷ھ سے ۱۲۰۳ھ تک تقریباً ہر سال کے قطعات فراہم کئے گئے ہیں، اس سے اس امر کا قیاس ہوتا ہے۔ کہ تمنا ۱۲۰۳ھ تک بقید حیات تھے۔

اس تذکرے کے متعلق جو امور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اس تذکرہ میں تمنا نے صرف اپنے معصر شعرا کا ذکر کیا ہے، جن میں سے اکثر زندہ تھے اور ان سے تمنا کو تعارف حاصل تھا، البتہ شمالی ہند کے بعض ایسے شعرا کا ذکر بھی آگیا ہے جن سے غالباً ان کو تعارف [illegible] نہیں تھا ممکن ہے مراسلت رہی ہو۔

۲۔ اکثر شعرا کے حالات میں سنین کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے اور واقعات

کو بقید سنہ قلمبند کیا ہے۔

۳۔ اکثر شعرا کے استادوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

۴۔ بعض شعرا کے کلام کے متعلق رائے بھی دی ہے۔

۵۔ بعض شعرا کے تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً عبدالوہاب بیکل نے ایک تذکرہ موسوم "بے نظیر" لکھا تھا اور بہاء الدین عروج نے تذکرہ "خزان و بہار" شاہ فضل اللہ فضلی نے فن سلوک میں زاد راہ اور اردو نظم میں دو کتابیں "قصہ پریم لوکا" اور قصہ "برہ بیوگا" کے مصنف ہیں۔

۶۔ بعض شاعروں کے حالات میں ان کے احباب اور ملنے جلنے والوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

۷۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے دو اردو شعر درج کئے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں:۔

باغ میں جانا ہے میرا کام کا　　شوق ہے مجھ کو گلابی جام کا

کہوں کیا اس کی بے پروائیوں سے دل پریشاں ہے۔
نہ آیا ایک دم مجھ پاس جس کا نام جاناں ہے

۸۔ اس تذکرہ پر دیباچہ نہیں لکھا گیا ہے۔ متن کتاب میں بھی تمنا نے اپنا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ فتوت اور شفیق نے اپنا حال بھی متعلقہ ردیف میں لکھ دیا ہے۔

۹۔ اورنگ آباد کے دوسرے دو تذکرہ نویس خواجہ خان حمید اور لچھمی نارائن شفیق کا اس تذکرہ میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ وہ تمنا کے ہمعصر تھے، اور انہوں نے اپنے تذکرے لکھ دیئے تھے اور اسی طرح شفیق اور حمید کے تذکروں میں تمنا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بنا پر ہو۔ کہ تمنا نے اس زمانہ میں شہرت حاصل نہ کی ہو۔ مگر تمنا کے تذکرہ میں حمید اور شفیق کا ذکر نہ آنا تعجب انگیز ہے۔

۱۰۔ فتوت کا ذکر تمنا نے کیا ہے، مگر تعجب ہے۔ کہ ریاض حسنی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ دوسرے مصنفین کی کتابوں کا ذکر ہے اور پھر یہ کہ اس وقت ریاض حسنی کی تالیف کو عرصہ گذر چکا تھا۔

۱۱۔ بعض شعرا کے ساتھ اپنے ہم درس ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔

۱۲ بعض شاعروں کی ملازمت اور ان کے مشاغل کی صراحت کی ہے۔

۱۳۔ اس تذکرہ سے بعض شاعروں کے متعلق جو صحیح معلومات حاصل ہوتے

ہیں۔ اس کی وجہ سے دوسرے تذکروں کے ناکافی تحقیق کی بنا پر پیدا کردہ شکوک
کا ازالہ ہو جاتا ہے، مثلاً شفیق نے اپنے تذکرہ میں نقد علی خاں ایجاد کا ذکر
کیا ہے، انجمن ترقی اردو کی جانب سے شفیق کا جو تذکرہ شائع ہوا ہے۔ اس
میں ایک اور ایجاد کا تحفۃ الشعرا کے حوالہ سے اضافہ کیا گیا ہے اور ان کا نام
مرزا علی نقی بتایا گیا ہے۔

تمنا کے تذکرے سے معلوم ہوا کہ یہ صحیح نہیں ہے، اس زمانہ میں دکن میں
ایک ہی ایجاد تھے ان کا اصلی نام تو مرزا علی نقی تھا اور باپ نقد علی خان تھے۔
دربار آصفی سے مرزا علی نقی خان کو نقد علی خان خطاب ملا تھا، اس طرح ایجاد کی
شخصیت ایک ہی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس تذکرہ میں صرف اردو شعرا ہی کا ذکر
نہیں ہے، بلکہ اس میں فارسی گو شعرا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ
ہی ان کا اردو کلام پیش کیا گیا ہے اور اس کو "ہندی" کی سرخی کے تحت
لکھا گیا ہے۔ دکن کے شعرا کے قطع نظر شمالی ہند کے جن شعرا کا اس میں ذکر ہے
ان کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱۔ سراج الدین علی خان آرزو (۲) مولانا غلام علی آزاد (۳) قزلباش خان امید

[illegible] (۵) محمد [illegible] ذکی [illegible] (۶) میرزا [illegible]

(۴) مرزا عبدالقادر بیدل (۵) بیدار (۶) [illegible]

سودا (۸) مرزا مظہر جان جاناں۔

ان میں سے بیدل اور مظہر کے اردو شعر نہیں ہیں۔ صرف فارسی کہے گئے

ہیں۔ دوسرے شعرا کا فارسی کے ساتھ اردو کلام بھی دیا گیا ہے۔ شعر کی

مجموعی تعداد [illegible] ہے۔

ذیل میں تذکرۂ تمنا سے چند شاعروں کے تذکرے بطور نمونہ درج کیے

جاتے ہیں۔

ایجاد } ایجاد از قوم [illegible] نام اصلی [illegible] [illegible] [illegible]
همدانی [illegible] شیخ علی خان وزیر شاه سلیمان صفوی [illegible]

مشهور بود، در عهد آصفجاه و بیدلی پادشاهی [illegible] [illegible] [illegible]

زمان خان ایجاد نیز بسیار قرب و مصاحبت خوب داشت، به خدمت [illegible]

لشکر سرفراز بود، بعد وفات [illegible] دیوانی [illegible] [illegible]

بعدش به داروغگی فیل خانه سرکار نواب صلابت جنگ سربلند گردید [illegible]

نظام الدوله فتح جنگ بهادر به خدمت [illegible] صاحبزاده [illegible] [illegible]

نصرت جنگ بهادر چندے سرگرم بود، در این ایام [illegible] [illegible] [illegible]

کرد، مرد بزرگ، خوش مزاج. غزل فارسیش چوں زلفِ خوباں مسلسل و مضامینِ تازہ از رخسارۂ محبوباں . . . . . . ریختہ اگرچہ زبانش نیست فامابزورِ طبیعت دقیقہ شناسی بحسن کیفیت سرانجام میدہد، گاہ گاہ اتفاق ملاقات می افتد، عزیزِ ہر کسے است حق سبحانہ سلامتش دارد۔

ایجاد بیٹھ رہ تو بخف کی زمین میں　　نقشِ قدم ہو خاک رہ بوتراب کا

ہم اسیروں کو تیرے زلفوں سے ہے دلبستگی
کون کافر چاہتا ہے ایسے داموں سے نجات

تربت پہ میری شمع اگر تو نہ لائے گا
جلتا رہوں گا حشر تلک میں کفن کے بیچ
تجھ لب سا کوئی عقیق نہ پایا سہیل نے
راتوں کو بھی چراغ لے ڈھونڈا یمن کے بیچ

جس طرح ہے عندلیبوں کو گلستاں کا تلاش　　اس طرح سے ہی مجھ کو شہرِ خوباں کا تلاش

بیٹھا ہوں تیرے ابروِ خمدار کے نزدیک
سر اپنا رکھا ہوں اسی تردار کے نزدیک
بکتا ہوں زرِ مہر کو بازارِ وفا میں
ان مولون گراں نہیں ہوں خریدار کے نزدیک

کسے دریا سا دل اپنا ہم اے دلدار دیتے ہیں
ہر اک کو ہم کہاں یہ گوہرِ شہوار دیتے ہیں

انور } محمد سیف اللہ انور سرو ہستیش از گلشن آباد خجستہ بنیاد سر کشیدہ از بادِ سن تمیز باکتساب علوم میل نمود و در چندے یکتا بر آمد فقیر داد ہم مکتب بلکہ اکثر اوقات باہم در حصول کتب فارسیہ در جناب حضرت محمد داد رضا صاحب قبلہ مد ظلہ شل شوکت و اسیر و چار عنصر مرزا سامع و قاری بود، و در عربیہ شیخ ادراک خود را از شعلۂ توجہ میر صاحب قبلہ میر انور الدین ولی سلمہ اللہ افروختہ، در عالم دوستہا آشنائے یگانہ است و در جہاں آشنائی ہا مفتخر زمانہ مرد لیست مودت پیشہ، و جولانے محبت اندیشہ، نہنگ سنیش در محیط خجستہ نہاد آشنائے امواج مضامین د بجور اشعار است و حبیب صبرش از تار کش پنجۂ عشق تار تار با مؤلف مودت صمیم

میدارد، برفاقت حضرت ابوے دام ظلہ وزاد قدرہ بسر می برد او سبحانہ سلامت دارد۔

مگر گنجِ شہیداں باغبان تھا اس بیاباں میں
جو لختِ دل سوا اگتا نہیں کچھ اس خیابان میں

ہو گئی گرد تیرے دام کے خوشبو صیاد،
بال بلبل سے مگر نکہت گل کرتے ہیں

عصمت کا لاف مار نہ گل میرے یار سے
بدنام تو بھی ہے گا چمن میں ہزار سے

ہے نمایاں رخ پہ تیرے خط ریحان آج کل
مور کے قبضہ میں ہے ملک سلیمان آج کل
عاشقوں کے قتل پر امروز فردا خوب نہیں
دیکھ لیں، ہو جائے گا کافر مسلمان آج کل

آرسی کو مت دکھا مژگان و ابرو ہمدگر
خنجر و شمشیر شیشہ میں لڑاتا ہے کوئی

آشفتہ } خواجہ ابوطالب خان آشفتہ، خلف اشرف خواجہ اشرف خان
بہادر غضنفر جنگ است، گلشن فکرش را تازہ آب و رنگ
قبل ازیں بداروغگی فیل خانہ نواب نظام الدولہ بہادر سرفرازی داشت و والدش
نیز بدیوانی پادشاہی بلدہ حیدرآباد مامور بود، جدش نواب عماد الملک مبارز خان
کہ احوالش بکتب تواریخ من وعن مندرج است. جوان صالح بزیور قابلیت
پیراستہ و بجواہر آدمیت آراستہ . . . . . با فقیر یگانگت تمام می دارد
و از کرم جوشیہائے فنبانہ روزے خود سرد مہری یاراں دفع می سازد، بسبب
پاس خاطر و مفرشد نش فقیر گاہ بگاہ بحک و اصلاح می پردازد، اگر عالم دوستیہائے
شاگردی و استادی را چہ دخل فاما این قدر باستمداد کردن او نوشتہ شدہ
چنانچہ خود گوید،

استاد افلاطونم و شاگرد نمنا   آشفتہ دو عالم . . . زمن امروز

سبز ہو نخل مرے آہ کا چھوٹا نکلا   قد دلدار ہوا سرو کا بوٹا نکلا

سجن کے منہ سے نکلتی ہے، اب شراب کی بُو
چمن میں جس طرح مہکے گلِ گلاب کی بُو
تمہارے زلفِ معنبر کے سامنے پیارے
کہاں مجال مقابل ہو مشکِ ناب کی بُو
وہاں کی خاک اے آشفتہ اپنے سر پہ رکھ
کہ جس زمین سے نکلے ہے بوتراب کی بُو

وہ اپنے گھر سے مست شراب نکلے ہے
طلوع صبح کا جوں آفتاب نکلے ہے

خون ہے کس کا نگار سچ کہیو　　تیرے دامن پہ یار سچ کہیو

میں کب سے ترا طالب دیدار کھڑا ہوں
رسوا شدہ کوچہ و بازار کھڑا ہوں
کرتا ہے اگر قتل تو پھر دیر کی کیا وجہ
حاضر ہوں ترے روبرو جلاد کھڑا ہوں

شاید ہے دست نازک گلرُوئے سبز پوش
یہ شاخ گل نہیں جو ہلے ہے چمن کے بیچ

سودا } مرزا رفیع سودا، در معنی پروری و مضمون گستری ممتاز است
صفائی ذہن وجودت طبعش بے نیاز . . . .
نیشکر را از چاشنی شعرش پائے حسرت در گل است، و عسل را از ذریعہ فکرش
نیش زنبور در دل،

دامن مکان اشک سے ہے دو قدم کی راہ،
آنکھیں چرا نہ سخت دل اتنے سفر سے تو

مے کشاں روح ہماری بھی کہیں شاد کرو
ٹوٹے گر بزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

سن کے یہ کہتا ہے میرے نالۂ جان کاہ کو
کیوں مجھے ایسا بنایا کیا کروں اللہ کو

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

کون کہتا ہے کہ مت اور دن سے مل ادہم سے مل
جس کے ملنے میں خوشی تیری ہو پر مجھ سے مل
(معارف ۱۹۲۵ء)

کیمبرج کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست

اس سے پہلے میں اپنے ایک مضمون میں ظاہر کر چکا ہوں، کہ انگلستان میں صرف لندن ہی میں اردو قلمی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں، بلکہ انگلستان کے دیگر حصوں میں بھی ان کا ذخیرہ موجود ہے، جس پر تفصیل سے کام کرنے کے لئے بڑے وقت کی ضرورت ہے۔

لندن میں انڈیا آفس، برٹش میوزیم اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں اردو مخطوطات جمع ہیں، اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں چند قلمی کتابیں بھی موجود

کا ذخیرہ کس طرح فراہم ہوا ہے، اس کی صراحت بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

یہ مخطوطات اڈورڈ فریم پوٹ (Edward Ephraim Pote) نے داخل کیں، یہ پوٹ متوطن ایٹن (Eton) کا لڑکا تھا، ۱۷۶۳ء میں اس نے کنگ کالج سے ڈگری حاصل کی اور مدراس (Madras) کی ماتحتی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہو گیا۔ اپنے ایک خط میں جو کالج کے نام ۱۸ فروری ۱۷۸۸ء کو پٹنہ سے روانہ کیا گیا ہے لکھتا ہے۔ کہ جس وقت سے وہ ہندوستان پہنچا ہے مشرقی علوم کی کتابوں کو جمع کرنے کا متمنی رہا ہے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو کر ۵۵۶ قلمی نسخے فراہم کرتے ہیں۔ یہ قلمی نسخے آخر میں خود پوٹ [illegible] میں ۱۷۹۰ء میں انگلستان پہنچے اور نصف کنگ کالج کو نصف ایٹن کالج (Eton College) کے حصہ میں آئے۔

ایک اور دلچسپ امر جو اس ذخیرہ کے متعلق عام طور سے پوشیدہ ہے، وہ یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ پوٹ کو یہ ذخیرہ کس طرح حاصل ہوا؟

یہ مخطوطات دراصل کرنل پولیر (Colonel Polier) کی ملک تھے۔ پولیر لیسن (Lausanne) فرانس کا باشندہ تھا، ۱۷۵۷ء میں ہندوستان آیا اگرچہ فرنچ تھا مگر انگریزوں سے خاص اتحاد تھا جس کی بنا پر

یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہوا، کلایو ([illegible]) اور وارن ہیسٹنگز ([illegible] [illegible]) کا اس پر بڑا اعتماد تھا۔

تیس سال تک یہ ہندوستان میں رہا، اور ہندوستانی علم ادب سے خاص طور پر واقفیت حاصل کر لی۔ اور بہت سی کتابیں جمع کیں، یہی پہلا شخص ہے جو وید کو یورپ میں لایا۔

۱۷۸۹ء میں یہ یورپ واپس آیا، اور وید اور چند قلمی کتابیں برٹش میوزیم کو تحفہ دیں اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ نے عربی اور فارسی کے چوبیس قلمی نسخے پیرس کے شاہی کتب خانہ کو تحفہ دیئے۔

پولیئر ([illegible]) اپنا جمع کردہ پورا ذخیرہ یورپ نہیں لا سکا تھا، جو پورٹ کے ہاتھ لگا اور اس نے چند سال بعد یورپ کو وہ ذخیرہ منتقل کر دیا۔

یہ ہے کنگ کالج میں اردو قلمی کتابوں کے جمع ہونے کی مختصر تاریخ۔

یونیورسٹی کی کیٹلاگ بالکل صحیح اور مکمل نہیں کہی جا سکتی، کئی ایک قلمی نسخے جو دیگر نسخوں کے ساتھ ایک ہی جلد میں شامل ہیں، ان میں سے اکثر کے ناموں کی صراحت کیٹلاگ سے نہیں معلوم ہوتی، تاوقتیکہ اصل کتابیں دیکھی نہ جائیں۔

یونیورسٹی کے مخطوطات سے قطع نظر دیگر کالجوں کے مشرقی مخطوطات سے
سے چونکہ بہت کم استفادہ کیا جاتا ہے اس لئے ان کی حالت چنداں بہترین
نہیں کہی جا سکتی،

برٹش میوزیم، انڈیا آفس، اڈنبرا یونیورسٹی کے مخطوطات جس عمدہ اور
بہترین حالت میں ہیں۔ وہ بات کنگ کالج اور کاپر کالج کے مخطوطات کو حاصل
نہیں ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اردو مخطوطات کی فہرست دی جاتی ہے:۔

ذخیرہ کتب خانہ یونیورسٹی

نمبر	نام	نمبر رجسٹر	نمبر	نام	نمبر رجسٹر
۱	قصہ سیف الملوک	[illegible]	۶	ہدایت المومنین	[illegible]15
۲	قصہ چہار درویش	[illegible]311	۷	لطائف بزبان اردو	[illegible]
۳	نقلیات ہندی	" "	۸	دیوان ولی	[illegible]
۴	دیوان سودا	[illegible]324	۹	طوطا کہانی	[illegible]
۵	ترجمہ تاریخ طبری	[illegible]	۱۰	باغ و بہار	[illegible]

۱۱	داستان بے نظیر	[illegible]
۱۲	قصہ سیف الملک	[illegible]

ذخیرہ کننگ کالج

۱	پدماوت	55
۲	دیوان ولی	164
۳	رامائن تلسی داس	196
۴	بیاض مراثی	65
۵	دیوان یقین	168
۶	دیوان میر تقی	274
۷	دیوان سودا	168
۸	دیوان آبرو	80
۹	مصباح الہادی	14
۱۰	گیان پوتھی (ہندی)	14
۱۱	فاضل علی پرکاش (〃)	60
۱۲	سہسرارس (ہندی)	219
۱۳	سندر سنگار (ہندی)	224
۱۴	ست سیا (〃)	60
۱۵	رامائن تلسی داس (〃)	196
۱۶	بھاگود ہا رام (〃)	54
۱۷	بھاگوت ٹوڈرمل (〃)	54
۱۸	بھاگوت بیرپتی (〃)	51
۱۹	سنگھاسن بتیسی (〃)	221
۲۰	جوگ باشسٹ (〃)	28
۲۱	بیکٹ چنتامن (〃)	60
۲۲	ارجن گیتا (〃)	14

کاپر کالج
Camper College

۱	ترجمہ انگلستان	20/I
۲	حکایت سوداگر تصنیف خوشدل	II
۳	دیوان گویا	III
۴	دیوان رضا	55

نمبر	نام کتاب		نمبر	نام کتاب	
۵	قصہ اور شاہ دیمن رخ بانو مصنف ہرچند کھتری	16	۱۶	قصہ سوداگر مصنفہ رسوا	66
۶	فیصلہ دیوانی	40	۱۷	پندنامہ مصنفہ حاجی ولی	99
۷	دیوان ولی	40	۱۸	بیاض منتقل غزلیات میر و مرزا	53
۸	مثنوی بےنظیر و بدر منیر	66	۱۹	لیلیٰ مجنوں مصنفہ تقی علی خان ہوس	64
۹	مثنوی در جواب دربار عشق تصنیف مصحفی	66	۲۰	مثنوی دلپذیر	55
۱۰	مثنوی قصہ سوداگر پسر تصنیف ضمیر	66	۲۱	پدماوت مصنفہ عبرت و عشرت	146
۱۱	مثنوی مرزا لطف علی	66	۲۲	لیلیٰ مجنوں مصنفہ میر تجلی	107
۱۲	قصہ زہرہ و بہرام تصنیف خورشید	66	۲۳	دیوان درد	107
۱۳	مثنوی سوداگر پسر تصنیف مرزا رفیع	66	۲۴	گلشن ہند	107
۱۴	مثنوی لیلیٰ مجنوں از نواب محبت خان	66	۲۵	قصہ گل بکاؤلی	26
۱۵	مثنوی اسرار محبت از محبت خان	66	۲۶	دیوان نصیر	47
			۲۷	کلیات نثار	185
			-	-	-

اس تفصیل سے اردو مخطوطات کی مجموعی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ اب چند مخطوطات کے متعلق مزید حالات مناسب تصور کرتا ہوں۔

۱۔ بیاض مراثی، یہ کنگ کالج کی ملک ہے جس میں فارسی مرثیوں کے علاوہ حسب ذیل دکھنی شعرا کے مراثی درج ہیں۔

ندیم، جلیل، مدحی، یاد، ہوشدار، مسکین، ہوشیار، عسکری، قربان، صلاح لطف، منعم، رضا، مستقیم، اکبر، چندا، صفی، شیدا، ریحاں، عنایت، مخلص، رمضانی، قادر کمتر، موالی، احمد، دل، معصوم، لطف، روحی، راز، اکبر۔

بعض کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

قادر

بیدل ہوا ہے عالم جب تیں وہ شہ گیا ہے	نگرے نگر میں ماتم جب تیں وہ شہ گیا ہے

رمضانی

اس شاہ سروراں کو سرور نہ کہوں تو کیا کہوں	اس ماہ دو جہاں کو انور نہ کہوں تو کیا کہوں

مدحی

یاران دو جگ کے شاہ پر صلوات سب کہو	معنی لالہ پر صلوات سب کہو

یاد

حضرت نبی اپنی نواسیاں کے خبر لیو   ہیں چو رن میں گھائل زخماں کی خبر لیو

ندیم

اے صبا غم کی خبر گھر گھر سوں کہہ   پھر مدینے میں نبی سرور کو کہہ

مستقیم

تشنہ لب رن میں کون آل پیمبر ہوتے   حاضر اس وقت اگر آن ساقی کوثر ہوتے

معصوم

آیا دل محرم سب جا عزا ہوتا ہے   ارض و سما بماتم نسلی تباہ ہوتا ہے

شیدا

سواری آج ہے شہ کی دیکھو یاراں محرم سوں   چلے ہیں آہ مظلوماں بہت دکھ درد ماتم سوں

احمد

صلوٰۃ بر محمد صلوٰۃ بر محمد   ہر دم بدم ہزاراں صلوٰۃ بر محمد

یعقوب علی کے گھن کا موتی نبی کے من کا

زہرا فاطمہ کے تن کا صلوٰۃ بر محمد

اکبر

ہے ہائے قاسم ہے ہائے قاسم   مارے تجھے کیوں ہے ہائے قاسم

ان کا انتقال ہوگیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد غلام علی عشرت بریلوی نے سنہ ۱۲۱۱ھ
میں اس کو مکمل کیا۔ تاریخ تصنیف بھی درج ہے۔ ملاحظہ ہو:-

یہ کہہ کر مثنوی میں سنے جو کی غور کوئی تاریخ اس کی کیجئے خوش حور
کہا دل نے اسے دیکھے جو شاعر بلا شک جانے تصنیف دو نادر

یہ نسخہ بڑی تقطیع کے ۱۰۰ اوراق پر ہے۔ مگر یہ بھی مکمل نہیں ہے آخری چند
صفحات نہیں ہیں۔

(۴) ترجمہ تاریخ طبری یہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے جس کی دو ضخیم جلدیں
ہیں۔ مترجم سید جعفر شاہ ابن سید قمر الدین ہیں۔ ابتدا میں چار ورق دیباچے کے
درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ اس وقت ہوا ہے۔ جب کلکتہ
میں یورپین اصحاب کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم ہوا تھا۔ مترجم نے اپنے
دیباچہ میں اردو کو ریختہ، اردوئے معلی، ہندوستانی، ہندی وغیرہ
نام سے موسوم کیا ہے جس سے واضح ہوسکتا ہے اس وقت یہ سب نام
زبان اردو کے متعلق استعمال کئے جاتے تھے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"ازیں جملہ ایک زبان ریختہ ہے۔ کہ تمام ہندوستان میں بیچ
رائج ہے۔ چونکہ ہندوستان میں صاحبان والا شان کو ہر وقت

ہندوستانی زبان بولنا ضرور ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ صاحبان عالیشان ولایت سے آکے اول اردوئے معلیٰ کی زبان سیکھیں اول اس مدرسہ میں زبان اردو کے سیکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ہندی زبان میں اگر کچھ شعر و مرثیہ لکھا ہوئے تو اس کو بارا بتنے سکتے ہیں یہ ایک مختصر یادداشت ہے ۔ ہمارے ذخیرہ کی جو انگلستان کے مدینۃ العلوم کیمبرج کے کتب خانوں کی زینت بنے ہیں ۔

(معارف ۱۹۲۹ء)

پیرس کے ہندوستانی مخطوطوں کی فہرست

تاریخ ہند کا مبتدی بھی اس سے واقف ہے ۔ کہ فرانسیسیوں کا تعلق ہندوستان کے ساتھ کب سے شروع ہوا ۔ تجارت کے ساتھ ساتھ جہاں ملک گیری ہوتی رہی وہاں ملک گیری کے ساتھ یہاں کے نایاب ذخیرے بھی یورپ کو منتقل ہوتے رہے منجملہ دیگر اشیا کے ایک قلمی کتابیں ہیں ۔ جو آج پیرس کے قومی کتب خانہ ببلیا تک نیشنل (Bibliothèque Nationale) میں موجود ہیں ۔ عربی ۔ فارسی ۔ سنسکرت

مرہٹی، تلنگی سے قطع نظر کرکے ہم کو صرف ہندوستانی سے بحث کرنی ہے۔

فرانس کا محقق اردو گارساں ڈی تاسی ہے جس کے خطبات کا ترجمہ رسالہ اردو اورنگ آباد میں نواب مسعود جنگ بہادر رونیر دسنے شائع کیا ہے۔ خیال یہ تھا۔ کہ گارسی ڈی تاسی کا پورا کتب خانہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں منتقل ہوا ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ صرف چند مخطوطے اس کے یہاں آئے ہیں اس کا پورا کتب خانہ کیا ہوا؟ کدھر گیا؟ کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں فرانس کے پروفیسر سنسکرت وغیرہ موسیو جو البلاق اس کی تلاش میں ہیں، ممکن ہے۔ پتہ چل جائے۔

معلوم ہوتا ہے، ڈی تاسی کے مرنے پر اس کے ورثا نے کتب خانہ کی حفاظت نہیں کی اور وہ منتشر ہو گیا، چنانچہ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ولی کا جو دیوان ہے۔ وہ ڈی تاسی کی ملک رہا ہے۔ اس پر اس کے نوٹس بھی ہیں، بہر حال افسوس ہے، اردو مخطوطوں کی یورپ کو منتقلی کے بعد بھی حفاظت نہیں ہوئی۔

پیرس کے قومی کتب خانہ کے اردو مخطوطوں کی کیٹلاگ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی ہے جس کا مصنف (A. Cabaton) ہے، یہ کیٹلاگ، انڈیا آفس،

کے متعلق بھی غلطیاں تھیں۔

منتظمین کتب خانہ کو جب ان امور سے آگاہ کرایا گیا۔ تو انہوں نے خاص طور پر مجھے اس امر کی اجازت دی کہ کتب خانہ کے صرف اردو مخطوطوں کی فہرست مرتب کر دوں۔

ظاہر ہے۔ یہ کام علاوہ وقت طلب ہونے کے کافی وقت کا مقتضی تھا بریں ہم فن کے لحاظ سے ایک فہرست مرتب کر دی گئی۔ جو غالباً طبع کی جائے گی۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے یہاں کے اردو مخطوطوں کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:-

مذہبی

۱- خلاصۃ المعاملات - ورق ۴۲ سطر ۱۵ مصنف سہیل . منظوم

۲- انواع العلوم ورق ۱۳۰ سطر ۱۵ " " "

۳- فقہ ہندی ورق ۱۲ سطر ۱۲ " امین "

۴- فرائض نفس " ۴۱ " ۱۳

۵- نورنامہ " ۱۰ " ۱۵ " الٰہی بخش "

۶- انتخاب کتب " ۵۲ " ۱۵ " کمال الدین "

منظوم

۷۔ نافع المسلمین ورق ۷۶ سطر ۱۶

۸۔ رسالہ سنا مہ ،، ۱۲ ، ۲۳ مصنف محمد باقر آگاہ ،،

۹۔ ہدایت نامہ ،، ۱۰ ،، ۲۳ ،، ،، ،،

تاریخ

۱۰۔ عاشور نامہ ورق ۵۰ سطر ۱۱ ،، عبد المالک ،، سنہ تصنیف ۱۱۰۰ھ

۱۱۔ نکات الشعرا ،، ۵۲ ، ۱۵ ،، میر تقی میر ،،

۱۲۔ گلشن ہند ،، ۱۵۲ ،، ۱۷ ،، مرزا لطف علی ،،

۱۳۔ تاریخ آسام ،، ۱۲۶ ،، ۱۵ ،، سید بہادر علی حسینی ،،

یہ احمد شہاب الدین کی تاریخ آسام کا جو ۱۰۷۳ھ میں مرتب ہوئی تھی ترجمہ ہے جس کو سید بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۵ء میں کیا ہے۔

۱۴۔ ہشت بہشت ورق ۲۱۱ سطر ۲۳ مصنف محمد باقر آگاہ ،،

۱۵۔ سری کشن ،، ۴۹۸ ،، ۱۵

قصص

۱۶۔ ترجمہ انگلستان ورق ۱۸۰ سطر ۱۱

۱۷۔ نسخہ ثانی ،، ۷۴ ،، ۱۱ صرف باب اول کا ترجمہ ہے

۲۴۔ پر فنا النسخہ . . . .

۲۵۔ ثمنوی راسخ ورق ۳۱ سطر ۱۱ مصنف راسخ سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ

۲۶۔ قصہ خاور شاہ " ۲۱۶ " ۱۱ " غلام حسین منظوم

داستانِ امیر حمزہ کی طرز پر شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانہ میں مرتب ہوئی

ہے۔ پہلا شعر:۔

کیا کہے اب زبان حمدِ خدا ماعرفناک جب نبی نے کہا

(۲۷) ثمنوی یوسف زلیخا ورق ۱۴۹ سطر ۱۴ مصنف محمد امین

سنہ تصنیف ۱۱۰۹ھ۔ یہ ثمنوی عالمگیر کے عہد میں بھروچ (گجرات) میں

لکھی گئی ہے۔ اس کے متعلق میں نے تفصیل سے علیحدہ مضمون لکھا ہے۔

جو "جامعہ" میں شائع ہوا ہے۔

۲۸۔ وامق وعذرا ورق ۴۰ سطر ۱۱ منظوم

۲۹۔ انشا نورتن " ۱۹۳ سطر ۱۵ مصنف محمد بخش مہجور شاگرد جرات غازی الدین

حیدر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے، سنہ تصنیف ۱۲۳۰ھ یہ نسخہ خود مصنف کا قلمی ہے۔

منظومات

۳۰۔ معراج نامہ ورق ۴۳ سطر ۱۵

۳۱- دوازدہ ماسہ ورق ۵ سطر ۱۱ مصنف کا نام باوجود تلاش نہ معلوم ہوا

۳۲- کلیاتِ سودا " ۳۳۴ " ۹ تا ۱۲ مصنف مرزا رفیع سودا

۳۳- نسخہ ثانی . . . .

۳۴- مجموعۂ کلام ورق ۳۳ سطر ۱۱ دلی اور سودا کا مختصر انتخاب ہے۔

۳۵- دیوانِ عاجز " ۶۰ " ۱۵ عارف الدین خان عاجز کا دیوان ہے۔
جن کی مثنوی لال و گوہر بھی مشہور ہے، اس کے دو نسخے انڈیا آفس اور ایک
نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔

۳۶- دیوان علیم اللہ شاہ ورق ۹۶ سطر ۹ مصنف علیم اللہ شاہ سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ

۳۷- مجموعہ کلام ورق ۱۷۶ سطر ۹ چند فارسی اور اردو غزلوں کا مجموعہ ہے

۳۸- راگ ہائے ہندی ورق ۴۵۴ سطر ۱۵

۳۹- کلام چراغ علی شاہ ورق ۲۲ سطر ۱۰ مصنف چراغ علی شاہ

۴۰- دیوانِ امان - ورق ۷۶ سطر ۱۱ مصنف امان

۴۱- تحفۃ النسا " ۱۸ " ۲۳ " محمد باقر آگاہ

۴۲- ریاض الجنان " ۷۲ " ۲۳ " "

۴۳- رسالہ فرقہ ہائے اسلام ورق ۷ سطر ۲۳ مصنف " "

۴۴۔ ہدایت نامہ ورق ۱۰ سطر ۲۲ مسنف محمد باقر آگاہ:

متفرق

۴۵۔ چند خطوط کسی غیر معروف شخص کے چند خطوط ہیں ورق ۱۱ سطر غیر معین

۴۶۔ لغت فارسی داردو۔ ورق ۱۲۱ سطر ۱۲

۴۷۔ آموز المنشی ورق ۱۷ سطر غیر معین

۴۸۔ چند یاد داشتیں، ورق ۳۰ سطر ۱۵

۴۹۔ اردو و فریخ۔ ورق ۱۰۲ سطر ۱۱

۵۰۔ آئین و قواعد افواج کمپنی علاقہ مدراس۔ ورق ۲۵ سطر ۱۳
انگریزی فوج مقیم مدراس کے متعلق فوجی قواعد اور سزا وغیرہ کے قانون بیان کئے گئے ہیں۔

۵۱۔ نامعلوم اسم۔ ورق ۱۱۲ سطر ۱۱
تصوّف میں ایک نامکمل کتاب ہے، پنجابی زبان میں لکھی گئی ہے۔
یہ ہے کل مخطوطوں کی تفصیل جو پیرس کے قومی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

(معارف ۱۹۳۰ء)

مؤلف کی دیگر کتابیں

۱۔ "دکن میں اردو" طبع ثالث مجلد — ۸ روپے

۲۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات — مجلد عہ غیر مجلد للعہ

۳۔ رہبر سفر یورپ — ۸ر

۴۔ حضرت امجد کی شاعری — غہ ر

۵۔ مکتوبات امجد — ۸ر

۶۔ خواتین عہد عثمانی — ۴ر

۷۔ نجم الثاقب — ۲ر

۸۔ خیابان نسواں — ۱۲ر

۹۔ سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری — ۰

۱۰۔ ذکر نبی صلعم — ۱۲ر

۱۱۔ مدراس میں اردو — ۸ر

ملنے کا پتہ

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

ناشران تاج کمپنی لمیٹڈ پبلشرز

نے

فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۹ سرکلر روڈ لاہور میں باہتمام عبدالحمید خاں
مینیجر کے چھپوا کر ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا

۱۹۳۹ء